Kautilya

الباکستان

ناول

طاہر اسلم گورا

البا کستان

ناول

طاہر اسلم گورا

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ اس اشاعت کا کوئی حصہ کسی بھی شکل میں کاپی، ترجمہ، ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا، بشمول الیکٹرانک یا کسی دوسرے ذریعے سے بازیافت، نہ ہی کسی بھی شکل میں یا کسی بھی طریقے سے، ناشر کی پیشگی اجازت کے بغیر اسے نشر کیا جا سکتا ہے۔

The views expressed in this book are personal views of the writer and it does not necessarily mean that the publisher is also in agreement with these views.

ISBN : 978-93-90885-46-6

Price: ₹ 260

First Edition: 2023

Copyright 2023, Tahir Aslam Gora, All rights reserved.

Published by: Kautilya Books
4378/4B, Ansari Road, Daryaganj
New Delhi-110 002
Phone: 011 47534346, +91 99115 54346
E-mail: mail@kautilya.in

Cover by: Kautilya Studio

Printed by: Konark Biz Pvt. Ltd., Daryaganj, New Delhi
Phone: 011 49936265

AlBakistan
by Tahir Aslam Gora

فہرست

پہلا باب 7
الباکستان میں فوجی آپریشن

دوسرا باب 15
بھارتی طیارے کا اغوا

تیسرا باب 21
اغواشدہ بھارتی طیارہ قندھار میں

چوتھا باب 26
اغواہ شدہ بھارتی طیارے کے لئے مذاکرات

پانچواں باب 30
پاکستانی جرنیلوں کی سیکس پارٹی

چھٹا باب 36
الباکستان کا پریس ڈیپارٹمنٹ اور شاعری

ساتواں باب 41
دہشت گردی کے خلاف جنگ کا آغاز

آٹھواں باب 47
الباکستان کے نئے ٹی وی چینلز

نواں باب 52
الباکستان اور امریکہ کی آگے بڑھتی شراکت داری

دسواں باب 58
الباکستانی سیاست نائن الیون کے بعد
گیارھواں باب 62
اسامہ بن لادن کی ہلاکت الباکستان میں
بارھواں باب 69
انڈین ایمبیسی الباکستان میں را کا دفتر
تیروھواں باب 78
ایک رائٹر کپتان خان کے دورِ حکومت میں
چودھواں باب 91
کارگل کی لڑائی کی یاد میں ایک گیت
پندرھواں باپ 97
ناول نگار کا اپنا کردار
سولہواں باب 103
انڈین فنکاروں کی الباکستان میں پذیرائی
سترھواں باب 107
یوتھیوں کا سیاسی و سماجی مائنڈ سیٹ
اٹھارھواں باب 112
یوتھیوں کی ورلڈ وائڈ سیاسی سوچ اور کپتان خان کی حکومت کا خاتمہ

البا کستان

ناول

طاہر اسلم گورا

اس کہانی میں بہت سارے ایسے کردار ہیں جو کسی بھی سماج کو تشکیل دیتے ہیں۔ یوں یہ کہانی ایک ایسے سماج کی کہانی ہے جس کا نام ہے 'الباکستان' اوراس کا مرکزی کردار بھی گویا یہی 'الباکستان' ہے۔ باقی کرداروں اور اداروں کے نام کسی بھی ملک کے کرداروں اور اداروں کے ناموں سے مماثلت رکھتے ہوں تو محض اتفاق ہے۔
وما علینا الا لبلاغ۔

*****

پہلا باب

الباکستان میں فوجی آپریشن

اکتوبر 1999ء

ایم این اے خرم جب اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں آخری ملاقاتی سے مل چکا تو بندوق بردار محافظ نے اطلاع دی کہ باہر بریگیڈیئر آصف جاوید المعروف بریگیڈیئر شوقین کی گاڑی پہنچ چکی تھی۔ "انہیں اندر لے کر آؤ اور خود باہر گیٹ پر بیٹھنا" اُس نے محافظ کو حکم دیا۔ "کیسے ہو ایم این اے صاحب؟" بریگیڈیئر نے کمرے میں گھستے ہی حال چال پوچھا۔ "میں اچھا ہوں، آپ اپنا سنائیے، کیسے یاد کیا؟" خرم نے ملاقات کی وجہ جاننا چاہی۔ "ملک میں کچھ تبدیلی ہونے والی تھی، پنجاب کے سیاستدانوں کا دماغ خراب ہو گیا تھا، آپ کے شہر کراچی کی مدد کی ضرورت ہو گی"۔ بریگیڈیئر نے وضاحت کی۔ "بتائیے، کھل کے بتائیے، شہر میں آگ لگا دیں؟" خرم نے کسی بڑے ایکشن کا اشارہ ڈھونڈنا چاہا۔ "نہیں، اس بار، آگ لگانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا اپنا چیف آج رات کو ملک پر قابض ہونے والا ہے۔ آپ نے اس کے آنے کی خوشی میں مٹھائیاں بانٹنا ہیں۔" بریگیڈیئر یہ کہہ کر کرسی سے اُٹھا۔ "اس بار آسان کام ہو گا، چیف صاحب کو ویلکم کرنے کے ساتھ ساتھ شہر کے حالات کو قابو میں رکھنا آپ کی پارٹی کا فرض ہو گا۔" بریگیڈیئر نے میز پر جھک کر خرم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ "بریگیڈیئر صاحب، یہ تو خوشی کی بات ہو گی مگر یہ فیصلہ آناً فاناً کیسے ہو گیا۔ میری معلومات کے مطابق چیف

صاحب تو بیرونِ ملک دورے پر تھے" خرم بیک وقت خوشی اور حیرت کے ملے جلے احساس کے ساتھ بولا۔ "پنجاب کے سیاستدانوں نے چیف صاحب کے بیرونِ ملک دورے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اُن کو ہٹانے کا گھٹیا منصوبہ تیار کیا تھا مگر چیف صاحب کے خلاف کوئی سازش اس ملک میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہمارے کمانڈوز وزیرِ اعظم سمیت تمام سازشی سیاستدانوں کو چند گھنٹوں کے اندر اندر گرفتار کر لیں گے، آپ ہمارے آپریشن کو دیکھنے کے لئے کمپیوٹر بند کر کے ٹی وی آن رکھئے"، یہ کہہ کر بریگیڈیئر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایم این اے خرم نے بریگیڈیئر کے نکلتے ہی لندن پارٹی قائد کو فون کر کے ملک میں آنے والی سیاسی تبدیلیوں کے بارے آگاہ کیا۔

پارٹی قائد نے خرم کو اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ معاملات بہت احتیاط کے ساتھ برتنے کی ہدایت کی اور یاد دلایا کہ یہ اسٹیبلشمنٹ اپنے باپ کے بھی سگی نہیں۔ "مگر سر ایک تو ہمارے پاس اپنی پسند ناپسند کا زیادہ اختیار نہیں اور دوسرا پہلی بار ایک مہاجر چیف آف دی آرمی اسٹاف مہاجروں کے لئے نرم گوشہ رکھنے کا پیغام پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے"، خرم نے قائد کو وضاحت کی۔

"یاد رکھنا کہ ایک تو فوج کا مہاجر جرنیل بھی پنجابی ذہنیت کا ہو جاتا ہے، دوسرا اسٹیبلشمنٹ سو فیصد پنجاب کی بالا دستی چاہتی ہے لہذا مہاجر جرنیل کے آ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ جرنیل اور اسٹیبلشمنٹ چونکہ اس بار پنجابی سیاست دانوں سے ٹکر لے رہے ہیں اس لئے وہ اپنے مفاد کی خاطر ہم مہاجروں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں مگر جیسے ہی اُن کا کام ہم سے پورا ہوا، یہ پھر اپنے پنجابی مرکز کو لوٹ جائیں گے۔ لیکن میں تمہاری بات بھی سمجھ رہا ہوں کہ ہمارے پاس اس پیشکش کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہیں لہذا اس کو قبول کر لو کیونکہ اس سے مہاجروں کو کچھ سالوں تک فائدہ پہنچے گا۔ پھر جب حالات بدلیں گے تو دیکھیں گے۔ ابھی تو پنجابی اسٹیبلشمنٹ اور سندھی نیشنلسٹوں کی ریشہ دوانیوں سے کچھ

عرصہ کے لئے چھٹکارہ ملے گا" قائد نے حسبِ معمول تقریر کی جس کو خرم نے بہت توجہ سے سنا اور دل سے قائل ہوا کہ قائد اتنے سالوں سے جلاوطن ہونے کے باوجود ملکی رمزوں کو اُن سب سے بہتر سمجھتے تھے۔

قائد سے فون بند ہونے کے بعد وہ بریگیڈیئر کی ہدایت کے مطابق ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا۔ خبروں میں بتایا جا رہا تھا کہ فوج کے ایک گروہ نے ٹی وی کی بلڈنگ پر قبضہ کر لیا تھا اور جنرل صاحب کے جہاز کو ملک میں واپس اُترنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ "یہ تو بالکل اُلٹ ہو رہا تھا" خرم کو تشویش ہوئی۔ اُس نے اپنی پارٹی کے ساتھی ایم این اے صاحبان کو فون ملانا شروع کیا تاکہ اُن سے تازہ صورتحال جان سکے۔ کسی کو بھی صورتحال کا ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا۔ پھر اچانک ٹی وی اسکرین پر تصویر کی بجائے لائینیں آنا شروع ہو گئی۔ 'خدا خیر کرے، جیسی تیسی خبریں تھیں وہ بھی گئیں'۔ دس منٹوں میں بریگیڈیئر آصف کا فون آ گیا۔ 'خرم صاحب، سب کچھ قابو میں ہے، جنرل صاحب کا طیارہ بحفاظت کراچی اُترنے والا ہے'، فوراً پارٹی ورکروں کو لے کر سڑکوں پر نکلیں اور جنرل صاحب کے حق میں نعرے لگوائیں، وزیر اعظم ہاؤس کا گھیراؤ کر لیا گیا ہے'۔ بریگیڈیئر نے بتایا۔ 'مگر بریگیڈیئر صاحب، ٹی وی پر جنرل بٹ کی تقرری اور جنرل اشرف کی برطرفی کی خبریں ابھی آ رہی تھیں۔' خرم بے یقینی کے ساتھ بولا۔ 'وہ خبر اب نہیں چلے گی۔ ٹی وی اسٹیشن پر ہمارا قبضہ ہو چکا ہے، وزیر اعظم ہاؤس کا گھیراؤ کیا جا چکا ہے، جنرل صاحب جلد ہی تقریر کرنے والے ہیں، بس اپنے کارکنوں تک یہ خوشخبری پہنچا دیں'۔ بریگیڈیئر نے اتنا بتانے کے بعد فون بند کر دیا۔ ٹی وی پر کسی قسم کی کوئی خبر نہیں آ رہی تھی۔ خرم نے موبائل فون کو تھاما اور ڈرائیور کو پارٹی دفتر چلنے کا کہا۔ وہاں گہما گہمی کی صورتحال تھی۔ پارٹی کے کچھ ایم این اے اور ایم پی اے موجود تھے۔ کچھ کے بارے معلوم ہوا کہ وہ آرمی کی ہدایت پر ائیرپورٹ کے رستے کارکنوں کو لے کر نکلے تھے۔ اُس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر میں قائد کا فون آنے والا تھا لہٰذا وہ اور آفس میں موجود دیگر ایم این اے اور ایم پی اے قائد کی ہدایات کا انتظار

کریں۔ جنرل اشرف کے جہاز کے لینڈ ہو جانے کی اطلاع آنے کے تھوڑی دیر بعد قائد کا فون آ گیا۔ "تو ساتھیو، آپ کے ہاں تو سیاسی اور محلاتی سازشیں ہوتی رہتی ہیں۔ اب کے بار جنرل اشرف کی پنجابی وزیرِ اعظم اور کچھ پنجابی جرنیلوں کے ساتھ ٹھن گئی تھی۔ پنجابی وزیرِ اعظم نے آرمی افسروں کو تقسیم کرنے کا سلسلہ کافی عرصے سے شروع کر رکھا تھا۔ اس لئے اُس کی پہلی حکومت کو بھی برطرف کیا گیا تھا مگر اب تو وہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ آئی ایس آئی کے چیف کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ بہرحال جنرل اشرف مہاجر ہے، اگرچہ اس کا اقتدار پر قبضہ پنجابی جرنیلوں کی مدد سے ہی ممکن ہوا ہے مگر ہماری پارٹی کے سامنے کبھی بھی زیادہ راستے نہیں رہے۔ ان حالات میں ہم جنرل اشرف کا ساتھ دیں گے۔ اس پنجابی وزیرِ اعظم نے کبھی بھی ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور نہ ہی آرمی نے کبھی حسنِ سلوک کیا ہے لیکن بہرحال جیسا کہ میں نے کہا کہ ہمارے پاس زیادہ چوائس نہیں..." قائد اپنی باتیں کرتے رہے اور خرم سوچ رہا تھا کہ اب دیکھنا ہے کہ آنے والے دن اور کون کون سے نت نئے سیاسی تماشے دکھاتے ہیں۔

چوہدری شبیر دن بھر کے ہنگاموں اور گورنر کے ساتھ فوٹو سیشن اور ایک ٹی وی چینل پر انٹرویو جیسی سرگرمیوں کے بعد بالآخر گھر کی طرف رواں تھا کہ رستے میں اپنے کزن کرنل عارف کی فون کال سے اطلاع ملی کہ اسلام آباد پر فوج کا قبضہ ہو چکا تھا۔ چوہدری شبیر کے باڈی گارڈوں نے، جو ایک قبضہ گروپ بھی چلاتے تھے، بڑی احتیاط سے اُسے گھر کے اندر پہنچایا۔ کرنل عارف نے اُسے فون پر بتایا تھا کہ چوہدری شبیر پنجابی وزیرِ اعظم کی پارٹی کا ایم این اے ہونے کے ناطے اپنے آپ کو ہاؤس اریسٹ سمجھے البتہ اگر وہ فوج کا ساتھ دینے کا وعدہ کرے تو وہ اُس کی جان بخشی کروا دے گا۔ چوہدری شبیر نے جواباً کرنل عارف کو فوج کا ساتھ دینے کی یقین دہانی کروائی اور آئندہ حکومت میں اُس کے لئے کوئی عہدہ ڈھونڈنے کی درخواست کی۔ اس نے اپنے ڈرائنگ روم میں ٹی وی آن کیا اور نئے فوجی صدر کے جہاز اترنے اور تقریر کرنے کی تیاریوں کی خبروں کو تشویش سے دیکھنے لگا۔ اُسے وزیرِ اعظم اور آرمی چیف کے مابین کشمکش کا

باقی اراکین اسمبلی کی طرح علم تھا۔ اُسے اپنی پارٹی کی حکومت جانے کی کوئی فکر نہ تھی، صرف یہ خیال ستائے جا رہا تھا کہ نئی فوجی انتظامیہ کہیں اُس کے مخالفین کا ساتھ دیتے ہوئے اُس کے پلازوں کے کاروبار کو خراب نہ کردے۔ 'اللہ مالک ہے، پیسے دے دلا کے کوئی نہ کوئی رستہ نکال ہی لوں گا'، یہ سوچتے ہوئے وہ تھکے بدن اور متفکر ذہن کے ساتھ ٹی وی پر نئے مارشل لاء لگنے کے مناظر دیکھنے لگا۔ پارٹی کی طرف سے بھی کوئی فون نہیں بج رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ سب کو اپنی اپنی پڑی ہو گی۔ مگر اُس نے خود سے تہیہ کیا کہ وہ اپنی خاندانی فوج کا ہی ساتھ دے گا۔ کرنل کی یقین دہانی پر کوئی بھی اُس کے گھر کے باہر ہاؤس اریسٹ کے لئے نہ پہنچا تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور جنرل صاحب کی تقریر سننے کے بعد اس نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ آہستگی سے کھولا، اُس کے نو اور سات سالہ لڑکے ماں کے ساتھ سوئے پڑے تھے۔ وہ دروازے کو آہستگی سے بند کر کے گھر میں واقع اپنی اسٹڈی کی طرف بڑھا۔ اپنا بیگ میز کے ایک طرف رکھ کر کمپیوٹر آن کیا اور کسی پورنو ویب سائٹ کھولنے کی غرض سے 'وائلڈ سیکس' کے الفاظ گوگل سرچ میں ڈالے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اسی کمپیوٹر پر ایک دوسرے صفحے کو کھولا جس میں فیس بک پر عُرس شریف کا اشتہار سامنے آگیا جہاں اُسے کل بطور مہمانِ خصوصی جانا تھا۔ پہلے صفحہ پر بہت ساری پورنو ویب سائٹ کے لنک آ گئے۔ یہ لنک آتے ہی اُسے اخباروں کی خبر یاد آئی کہ اُس کے پیارے وطن الباکستان کے لوگ دنیا میں سب سے زیادہ پورنو گرافک ویب سائٹوں کی تلاش کے ضمن میں نمبر ون قرار پائے تھے۔ 'اس میں یقینی طور پر میرے وطن کا کوئی قصور نہیں، بلکہ لوگوں کا تھا'، اُس نے ایک سیاستدان ہونے کے ناطے سوچا۔ دس پندرہ منٹ پورنو ویب سائٹوں پر صرف کرنے کے بعد دن بھر کی تھکاوٹ پر نیند غالب آنا شروع ہو گئی۔ اگرچہ مکمل نیند میں جانے سے پہلے اُس نے ذہنی طور پر کل کے عرس شریف کے لئے تقریر کا ابتدائیہ بھی سوچا، ساتھ ساتھ نئی اداکارہ ریحانہ کا الف ننگا بدن بھی اُس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا۔ ساجھے مافیا کے بارے بھی اُس کے ذہن میں کچھ لاوا پکنے لگا۔ وہ انہی باتوں میں

گھرا اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھا اور سوئی ہوئی بیوی کو بچوں کے کمرے سے اُٹھا کر اسی اسٹڈی روم میں لے آیا اور فوری طور پر اُس کی چھاتیاں ملنے لگا۔ صبح چوہدری شبیر کی بیوی ناصرہ کا اپنی شلوار کی تلاش میں ہاتھ کمپیوٹر ماؤس سے ٹکرایا تو اسکرین کھل گئی جس پر حسبِ معمول ایک پورنو سائٹ پر بھری چھاتیوں والی ننگی لڑکی کی شبیہ اُس کے منہ کو آتی تھی۔ اُس کا ہر روز کی طرح جی چاہا کہ وہ اُس کمپیوٹر کے ٹکرے ٹکرے کر دے مگر خاموشی سے کمرے کا دروازہ پیچھے سے بند کر کے اسٹڈی سے باہر نکل گئی۔ واش روم میں گھسنے سے پہلے اُس نے کلاک پر نگاہ دوڑائی، ابھی صبح کے چھ بجے تھے۔ بچوں کو سات بجے اُٹھانے سے پہلے اُس نے ملازموں کے لئے کاموں کی ایک فہرست ترتیب دینے کا سوچا۔ مگر اس سوچ کے اوپر اُس ننگی عورت کی تصویر اُس کے اعصابوں پر جیسے سوار ہو گئی تھی۔ باتھ روم میں فلش کے اوپر بیٹھی سوچنے لگی کہ کاش وہ کسی سیاستدان کی بیوی ہونے کی بجائے کسی عام شخص سے بیاہی ہوتی تو تب وہ دیکھتی کہ اُس کا شوہر کس طرح دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتا۔ 'اگر میں انگلینڈ کی بجائے اسی شہر میں پلی بڑھی ہوتی تب مجھے شاید اس بات کا احساس بھی نہ ہوتا کیونکہ اس الباکستان المعروف نیکستان میں تو ہر بااثر مرد اپنی بیوی کے علاوہ کئی کئی عورتوں سے تعلق رکھنے میں فخر محسوس کرتا تھا،' اُس نے سوچا۔ 'خیر چوہدری کی ایک بات اچھی تھی کہ وہ میرا اور بچوں کا بہت خیال رکھتا تھا، باقی اُس کو گند کھانے سے میں کیسے روک سکتی تھی، میں تو اس دیس کے سارے بااثر عورتوں مردوں کے عجب ہی ڈھنگ دیکھتی ہوں۔ سب اللہ رسول کا نام لئے جاتے ہیں اور اپنے لئے کسی قسم کی کوئی اخلاقی قدر یا قانون کی بالا دستی کو خاطر میں نہیں لاتے' اُس نے تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اپنی سوچوں کو جھٹکنا چاہا۔

حکمران جماعت کے بہت سارے سیاستدان قید ہو چکے تھے جن کی اکثریت فوجی افسران کو یقین دہانی کروا رہی تھی کہ وہ مکمل طور پر فوج کے ساتھ تھے۔ لہٰذا انہیں نہ صرف رہا کر دیا جائے بلکہ فوج کی نگرانی میں بننے والی نگران حکومت میں ذمہ داری سونپ دی جائے۔ اُدھر قومی ایئرلائن کے اس جہاز کی ٹیلی ویژن اسٹیشنوں پر صبح

دوپہر شام خبریں چل رہی تھیں اور جن میں بار بار بتایا جا رہا تھا کہ کس طرح برطرف وزیراعظم نے جنرل صاحب کو ایک سو اسی مسافروں کے ساتھ مارنے کا منصوبہ بنایا تھا جو سری لنکا سے آرہے تھے اور اُن کے جہاز کو اُترنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ خبروں اور ٹی وی رپورٹوں میں بار بار بتایا جا رہا تھا کہ صرف چند لیٹر تیل جہاز میں رہ گیا تھا۔ اگر جہاز کو اترنے کی اجازت نہ ملتی تو وہ گر کر تباہ ہو جاتا مگر پاک فوج کے مستعد نوجوانوں نے عین موقع پر کراچی ائیرپورٹ اور اسلام آباد ٹی وی پر قبضہ کر کے اس مذموم منصوبہ کو ناکام بنادیا تھا۔ ٹی وی کے ایک سینئر پروڈیوسر سید وقار ایک خاتون نیوز کاسٹر ہما کے ساتھ اپنے دفتر میں بیٹھے ایک بڑی سی ٹی وی اسکرین پر بار بار چلنے والی فوٹیج کو دیکھ رہے تھے۔ "ہما مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے خیال میں اتنی بڑی بریگیڈ 101 آدھ گھنٹے کے نوٹس پر نکل پڑی ہو گی، مجھے تو یوں لگتا ہے کہ فوج نے بہت پہلے سے ہی تختہ اُلٹنے کی منصوبہ بندی کر رکھی تھی" سید وقار نیوز کاسٹر ہما سے مخاطب ہوئے۔ "سر، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ فوج اور وزیراعظم کی بہت مہینوں سے ٹھنی ہوئی تھی۔ وزیراعظم صاحب نے آئی ایس آئی کے چیف اور چند جرنیلوں کو اپنے ہاتھ میں لیاہوا تھا جب کہ جرنیلوں کی اکثریت جنرل اشرف کے ساتھ اس لئے تھی کہ وہ فوج کو مزید وزیراعظم کے ہاتھوں ٹوٹتا دیکھنا نہیں چاہتے تھے اور ویسے بھی اندر کے لوگ بتاتے تھے کہ جنرل اشرف فوج کے اندر سیاست کرنے کے ماہر تھے" ہما نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا کہ جیسے اُس سے زیادہ کوئی باخبر نہ ہو۔ "جانم چھا گئی ہو، تم سے زیادہ اندر کا شخص بھلا کون ہو سکتا ہے، مجھے معلوم ہے بڑے بڑے فوجی افسروں سے تمہارے تعلقات ہیں، میں اس بات پر بہت جلتا ہوں"۔ سید وقار نے سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ "سر، ذرہ نیوزروم سے چیک کریں کہ آئی ایس پی آر کا تیار کردہ نیوز بلیٹن آ گیا ہے، مجھے اُس کو لائیو پڑھنے سے پہلے ایک نظر دیکھنا بھی ہے، میری خبروں میں صرف اٹھارہ منٹ رہ گئے ہیں" ہما نے نیوز پروڈیوسر کی جلن کی پرواہ کئے بغیر کام کی بات پر زور دیا۔ سید وقار نے ہما پر نگاہیں جمائے نیوز روم سے بات کرنے کی خاطر انٹرکام اٹھایا۔

جب نیوز کاسٹر ہما لائیو خبریں پڑھ رہی تھی تو عین اُسی وقت روزنامہ ابن الوقت کے مدیر خبریں سننے کے دوران الباک فوج کی مستعدی و چستی کے بارے اپنا اداریہ لکھنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے پوری قوم کو فوج کی حب الوطنی کے بارے اپنے قلم سے جھنجھوڑ رہے تھے کہ اے ہم وطنو، اب بھی سمجھ جاؤ کہ اس ملک کی اندرونی و بیرونی حفاظت کا ٹھیکہ صرف اور صرف الباک فوج کے پاس ہے۔ لہذا جو بھی اس سے اختلاف کرے گا وہ نہ صرف غدار کہلائے گا بلکہ دائرہ اسلام سے بھی خارج ہو گا۔ شام کو روزنامہ ابن الوقت کا اداریہ چھپا تو سیاہ بوٹوں کی تھاپ پر چلنے والے خاکی جسموں نے اس اداریے کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ فوج کے پریس ڈیپارٹمنٹ نے دس لاکھ روپے نقد اگلے روز اخبار کی مدد کے لئے بھیجے۔ جبکہ معزول وزیر اعظم کے سابقہ پریس سیکرٹری نے اُردو معلّیٰ کی معروف مغلظات کو پنجابی غلاف چڑھاتے ہوئے مدیر ابن الوقت کو فون کیا اور کہا کہ سابقہ وزیر اعظم کی وہ رقم واپس کرو جو ابھی چار روز پہلے تمہیں دی گئی تھی۔ مدیر موصوف نے معزول وزیر اعظم کے پریس سیکرٹری کو تمیز سیکھنے کا سبق دیتے ہوئے تنبیہ کی۔

☆☆☆☆☆

دوسرا باب

بھارتی طیارے کا اغوا

دسمبر 1999ء

اس فوجی بغاوت کے قریب دو ماہ بعد ملک الباکستان کے ہائی جیکر ہمسایہ ملک بھارت کے جہاز کو ایک پہاڑی ملک سے واپس بھارت کی پرواز کے دوران ہائی جیک کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تعداد میں وہ پانچ ہائی جیکر تھے جو الباکستان کی جانب سے بھارت پر دھاک بٹھانے نکلے تھے اور وہ وادی کشمیر میں دہشت گردی کی کارروائیوں کے الزام میں گرفتار بھارتی جیل میں بند تین بین الاقوامی سطح کے دہشت گردوں کو چھڑانے کا عزم لئے ہوئے تھے۔ جہاز کو بھارت، الباکستان اور عربستان کے شہروں میں اُتارنے اور وہاں مسافروں کی مارکٹائی کرنے اور جہاز کا تیل حاصل کرنے کے بعد ہائی جیکر اُس کو ملکِ افغانستان کے شہر قندھار لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے جہاں کی واحد سیاسی جماعت طالبان تختہ حکومت پر قابض تھی۔ یہ جماعت خود کو سیاسی کی بجائے مذہبی کہلوانا پسند کرتی تھی۔

اُس ساری کامیاب پلاننگ کی نگرانی ملک الباکستان کے مختارِ کُل انٹیلی جنس ادارے آئی ایس آئی کا ایک بریگیڈیئر آصف جاوید کر رہا تھا۔ بریگیڈیئر نے جب سی این این انٹرنیشنل ٹی وی پر جہاز کے شہر قندھار میں اُترنے کی خبر سُنی تو اُسے یقین نہیں آ رہا

تھا کہ اُس کے تیار کردہ ہائی جیکر اِس قدر سمجھدار اور جیالے نکل سکتے تھے۔ بریگیڈیئر نے کامیابی کی سرشاری میں کرنل عارف کو قندھار فون کیا جو طالبان حکومت کو مختلف اُمور کے حوالے سے ہدایات دینے پر مامور تھا۔

"مبارک ہو کرنل، مشن کامیاب ہو گیا۔ ہم بھارت کے اِس جہاز کو بالآخر قندھار ہی لانا چاہتے تھے جو خدا کے کرم سے دُنیا کی محفوظ ترین جگہ ہے اور جہاں دُنیا کی کوئی طاقت پہنچنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ مبارک ہو کرنل، تمہارا اور میرا منصوبہ کامیاب ہو گیا۔" بریگیڈیئر نے قندھار کی ہاٹ لائن پر کرنل سے بات چیت کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"بریگیڈیئر آپ کو بھی مبارک ہو۔ میں طالبان کے کمانڈوز سے مکمل رابطے میں ہوں، اُنہوں نے جہاز کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد خود وہاں پہنچنے والا ہوں، اوور ٹو یو"۔

"خوب، بہت خوب۔ احتیاط کرنا۔ طالبان حکومت نے پہلی مرتبہ چند غیر ملکی رپورٹروں اور ٹی وی کیمروں کو سین پر پہنچنے کی اجازت دی ہے۔ اُن کے کیمروں سے بچنا۔" بریگیڈیئر آصف نے ہدایت دی۔

"سر فکر نہ کریں۔ یہ رپورٹر اور کیمرہ مین بھی اپنے لوگ ہیں۔ اُن کی ایک ایک ایم فوٹیج میری منظوری کے بغیر باہر نہیں جائے گی۔ ہم دُنیا کو اُتنا ہی دکھائیں گے جتنا دکھانا چاہیں گے"۔ کرنل نے وضاحت کی۔

"بہت خوب بہت خوب، میں بھی تھوڑی دیر میں قندھار پہنچنے والا ہوں۔ آئندہ دو گھنٹوں کے اندر یہاں ضروری میٹنگز ہیں۔ اُن کے فوراً بعد خصوصی طیارے کو لے کر پہنچ رہا ہوں"، بریگیڈیئر نے مشن کی کامیابی کی خوشی میں تالی بجاتے ہوئے کرنل کو اطلاع دی۔

*****

بریگیڈیئر آصف سپہ سالار اعلیٰ کے عالی شان کمرہ انتظار میں چیف آف دی آرمی اسٹاف جنرل اشرف سے ملاقات کا منتظر بیٹھا تھا۔ اُس کے جسم کے پور پور میں بے چینی، کامیابی کی سرشاری اور دو گھنٹے بعد قندھار کی طرف اُڑان کے خیال نے مہم جوئی کی کیفیات سمیت ایک عجیب و غریب قسم کی ہلچل رچائی ہوئی تھی جس کو وہ اپنے اندر مکمل جذب کرنے کی صلاحیت پیدا نہ کر سکنے پر جھنجھلاہٹ کا بھی شکار ہو رہا تھا۔ اوپر سے چیف صاحب کے انتظار کی گھڑیوں نے اُس کے اعصابی تناؤ میں اضافہ کر رکھا تھا۔ یہ وقت بالآخر آ ہی گیا تھا کہ چیف صاحب اُس کے ساتھ ون اون ون ملاقات کرنے پر مجبور تھے۔ اور وہ بھی رات کے نو بجے۔ اُس ہنگامی ملاقات کی نوعیت کا علم یا تو اُسے تھا، یا پھر چیف صاحب کو یا پھر اُس کے ڈائریکٹر جنرل کو۔ 'یا پھر ہو سکتا ہے کہ کُچھ خفیہ کیمرے بھی اُس کی چیف صاحب سے ملاقات کو ریکارڈ کر رہے ہوں' یہ خیال آتے ہی اُس نے ہال نما کمرے کی اونچی چھتوں کے چاروں کونوں پر نگاہ دوڑائی کہ شاید کہیں کوئی کیمرہ چھت سے لٹکے وکٹورین طرز کے پنکھوں یا پھر سینکڑوں لڑیوں والے کرسٹل فانوس میں نصب نظر آجائے۔ پھر فوراً ہی اُس نے اوپر اور دائیں بائیں دیکھنے کے عمل کو یہ سوچ کر ترک کر دیا کہ اگر خفیہ کیمرے نے اُس کی چاروں اور ڈھونڈتی نظروں کو ضرورت سے زیادہ ریکارڈ کر لیا تو یہ ریکارڈنگ بذاتِ خود اُس کو بڑے افسروں کی نگاہ میں مشکوک بنا سکتی تھی۔ اُس نے نظریں نیچے قالین پر گاڑ دیں۔ اُسی لمحہ اُسے قالین کے نیچے بچھے لکڑی کے فرش پر کمرے کے اندر کسی کے قدم رکھنے کی چاپ سُنائی دی۔ وہ اپنے اعصابی تناؤ کے نتیجہ میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس سے قریب چار قدم کے فاصلے پر چیف کھڑے تھے۔ اُس نے سلیوٹ کے لئے اپنا دایاں بازو بلند کیا۔ "اِس سارے آپریشن کے آپ انچارج ہو؟" چیف صاحب نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

"یس سر" اُس کا ہاتھ ہنوز ماتھے پر سلیوٹ کرنے کے انداز میں اُٹھا ہوا تھا۔

"مجھے تمہارے ڈائریکٹر جنرل نے اِس آپریشن کے بارے تب بتایا تھا جب دُشمن ملک کے جہاز کے اغوا کی پہلی خبر آئی تھی۔ مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ ہمارا کوئی ڈیپارٹمنٹ اِس آپریشن کی تیاری بھی کر رہا تھا۔" چیف صاحب نے شکوے کے انداز میں کہا۔ پھر انہوں نے خود ہی اپنے شکوے بھرے لہجے پر قابو پانے کوشش میں باریک سی مُسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں پر پھیلاتے ہوئے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ "خیر مجھ سے زیادہ خفیہ آپریشنوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔ ساری عُمر ایسے ہی آپریشنز سے گزرتے ہوئے فوج کی کمان سنبھالی ہے"، یہ کہنے کے بعد وہ چند ثانیوں کے لئے خاموش ہوگئے۔اُس خاموشی کے دوران بریگیڈیئر یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ چیف صاحب کوئی خصوصی ہدایت دینا چاہتے تھے یا پھر اُس کی روانگی سے قبل اُسے ملاقات کا شرف بخشتے ہوئے یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ وہ اُس کے مشن کی تائید کرتے تھے۔ پھر اُسے خیال آیا کہ اُس کے باس اور اُس کے خصوصی سیل کو چیف صاحب کی تائید بھی درکار نہ تھی۔ وہ اپنے فیصلے کرنے میں مکمل خودمختار تھے۔

"اَب جبکہ پوری دُنیا کی نظریں اِس واقعہ پر لگی ہوئی ہیں" چیف صاحب نے خاموشی توڑی اور بُڑبڑانے کے انداز میں بولے "بس اَب احتیاط کرنا۔ دُشمن طاقتیں ہمیں ملوث قرار دیں گی۔ سارے میڈیا کو اور طالبان کو سمجھا دینا کہ کسی صورت ہمارا عمل دخل نہ مانیں۔ ہمارا کام ہے نہ ماننا دُنیا جو چاہے کہتی پھرے۔ باقی کام بیک وقت صدر اور چیف ہونے کے ناطے میں سنبھال لوں گا،، گُڈ لک"۔

گُڈ لک سُنتے ہی بریگیڈیئر آصف نے جذباتی والہانہ پن کے ساتھ پاؤں کو اوپر اُٹھا کو پھر سے سلیوٹ مارا۔ چیف صاحب اُس کے سلیوٹ کے جذبے کو پوری طرح سراہے بغیر کمرے سے باہر چل دیئے تھے۔ اُن کے اچانک چلے جانے کے بعد فوجی ہیڈکوارٹر میں ہونے والی اُس انتہائی خفیہ ملاقات کی رازدارانہ خاموشی کو اُس نے ایک دم سے رگوں تک اُترتے محسوس کیا۔ اُسے چیف صاحب سے اپنی ملاقات کا منظر دوسری جنگِ عظیم پر بننے

والی کسی فلم کے منظر کی طرح لگا جس میں فقط دو اہم ترین لوگ دُنیا کے بارے کچھ بڑے فیصلے کرتے تھے۔ اِنہی محسوسات کے جلو میں اُس نے چیف صاحب کی گاڑی کے اِنجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سُنی تھی۔ اُس نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ اپنے سُپر باس یعنی آئی ایس آئی کے ڈی جی صاحب سے ملاقات میں دس منٹ باقی تھے۔ ڈی جی صاحب سے ملاقات بھی اِسی کمرہ میں ٹھیک دس منٹ بعد طے تھی۔ وہ اپنے شَل اعصاب کو اِس اثناء میں آرام پہنچانا چاہتا تھا۔ مگر حالات و واقعات کی سنگینی، مُلکِ افغانستان کی طرف روانگی کی تیاری اور پھر وہاں پر ہنگامی صورتحال کا سامنا کرنے کے خیال نے اُس کے اعصابوں کو جیسے جکڑ رکھا تھا۔ پھر اُس کا ذہن خود ہی تصور کرنے لگا کہ چیف صاحب رات کی تاریکی میں اِس فوجی ہیڈ کوارٹر کے اندر خود گاڑی چلا کر اپنی رہائش گاہ تک گئے ہوں گے اور اَب ڈی جی آئی ایس آئی بھی خود ہی گاڑی چلا کر پہنچ رہے ہوں گے۔ 'اعلیٰ سطح کی ایسی خفیہ ملاقاتوں کا طریقہ بھی یہی ہونا چاہئے کہ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہو' اُس نے سوچا۔ بریگیڈیئر اُس کمرے کے اندر ٹہلتا چیف صاحب کے جانے اور ڈی جی صاحب کے آنے کے منظروں کو تصور میں لاتے ہوئے خود کو اُس کمرے کا قیدی سمجھنے لگا۔ اُسے باہر کی تاریکی میں روشوں کے ساتھ ساتھ چلنے والی کیاریوں میں لگے رات کی رانی کے پھولوں کی مہک یاد آئی جو اُس کے نتھنوں میں تب سے بسی ہوئی تھی جب وہ اپنی گاڑی کو پارک کرنے کے بعد اُس کمرے تک پیدل چلا تھا۔ اِتنے میں ایک اور گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ اُسے یقین تھا کہ اَب کے ڈی جی صاحب ہوں گے۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ چیف صاحب کے آنے پر کسی گاڑی کے رُکنے کی آواز تو نہیں آئی تھی، صرف اُن کے جانے پر گاڑی اسٹارٹ ہوتی سُنائی دی تھی۔ اِس سے پہلے کہ وہ اِس معمہ پر غور کرتا ڈی جی صاحب گلہ صاف کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اپنے باس کو سامنے دیکھ کر نہ تو وہ نروس ہوا تھا اور نہ کسی ایکسائٹ منٹ کا شکار۔ اُس نے بڑے اعتماد کے ساتھ اُنہیں سلیوٹ مارا۔

"کیا خبریں ہیں بریگیڈیئر؟" ڈی جی اُسی لہجہ میں اطمینان کے ساتھ اُس سے گویا ہوئے جو اُن کا معمول کا لہجہ تھا۔

"سر آپ کے پاس تازہ خبر ہو گی، میں تو چیف صاحب سے اور آپ سے ملاقات کے لئے اِس کمرہ میں آدھ گھنٹہ سے زائد بیٹھا ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ ہمارے طالبان نے صورتحال کو کس طرح قابو میں رکھا ہوا ہے" اُس نے حالات کو جاننے کی غرض سے ذرا بے تکلفی کے ساتھ کہا۔

"ابھی تک حالات وہاں قابو میں ہیں۔ ہائی جیکرز نے جہاز اور مسافروں کے عوض بھارت سے اپنے مولانا صاحب، نوجوان مجاہد اور کشمیری لیڈر کی رہائی کا مطالبہ کر دیا ہے"۔ ڈی جی صاحب نے تازہ معلومات فراہم کیں۔

"سر، میں اَب وہاں جا رہاہوں۔ اِس کے علاوہ وہاں کوئی حکم؟" بریگیڈیئر نے دوبارہ سلیوٹ کی پوزیشن میں آتے ہوئے پوچھا۔

"اگر کوئی مزید بات ہو گی تو میں بالواسطہ تُم سے رابطہ کر لوں گا۔ جیسا کہ تُم اپنے کام کو اور اپنے اِس بے بی آپریشن کو جانتے ہو، اور تُم بہت حد تک اپنے فیصلے کرنے میں خود مختار ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تُم اِس آپریشن کو خود ہی کامیاب بنا لو گے۔" ڈی جی نے اُسے ایک طرح سے آپریشن کے خفیہ ہونے کی یاد دلائی۔

"تھینک یو سر" یہ کہتے ہوئے اُس نے تیسری بار سلیوٹ مارا۔

☆☆☆☆☆

تیسرا باب

اغواشدہ بھارتی طیارہ قندھار میں

آرمی ائیر بیس سے اُڑنے والے خصوصی طیارے میں بیٹھے اُس نے اپنے اُڑتے ذہن کو تھپتھپانے کی کوشش کی۔ اُس چھوٹے سے کیبن میں اکیلے ہونے کی وجہ سے وہ کسی حد تک اپنے ذہن کی پرواز کو نسبتاً نیچے لانے میں کامیاب بھی ہو رہا تھا۔ ابھی وہ تھوڑی دیر اونگھا ہی تھا کہ ایک گھنٹے کے دورانیہ پر مشتمل یہ فلائٹ قندھار کی ائیر بیس پر اُتر گئی۔ اُس کا استقبال کرنے کے لئے کرنل عارف اور طالبان ایلچی موجود تھے۔ اُس وقت رات کا ایک بجا ہو گا۔

"کیا آپ کی حکومت کا جانثار ہائی جیکرز سے رابطہ ہے" بریگیڈئیر آصف طالبان ایلچی سے گلے ملتے ہوئے مخاطب ہوا۔

"سر میری ایک گھنٹہ پہلے ہائی جیکروں کے سرغنہ مُلا شبراتی سے بات ہوئی تھی وہ امرتسر، لاہور اور دوبئی کے رت جگوں کے بعد قندھار میں بہت آرام محسوس کر رہے تھے۔ یہاں پر اللہ کے کرم سے اُنہیں کسی بات کا خوف نہیں۔ ضرورت پڑنے پر طالبان مجاہدین جہاز کے اندر بھیج دیئے جائیں گے"۔ ایلچی کے جواب دینے سے پہلے کرنل عارف نے باضابطہ رپورٹ پیش کی۔ "سر ہمارے مجاہدین کافر مسافروں کے گلے کاٹنے کے لئے بے چین ہو رہے ہیں۔ افغانستان میں کافر کم ہونے کے باعث ہمارے

مجاہدین دوسرے ملحد فرقوں سے تعلق رکھنے والوں کو مارتے مارتے کچھ تھک سے گئے تھے" اَب کی بار ایلچی مخاطب ہوا۔

"نہیں نہیں، اِس کی ضرورت نہیں۔ ہم پر بہت بین الاقوامی دباؤ ہے۔ ہمارا ٹارگٹ کافرستان سے اپنے مجاہد لیڈر آزاد کروانا ہے اور ساتھ ساتھ دُنیا کو یہ پیغام بھی دینا ہے کہ ہم کشمیر، افغانستان اور فلسطین کی آزادی کے لئے کُچھ بھی کر سکتے ہیں" بریگیڈیر نے فرطِ جوش میں کہا۔

"سر، افغانستان تو اللہ کے فضل سے آزاد ہے، کشمیر کو ہم الباکستان کے لئے لے کر رہیں گے مگر فلسطین کی آزادی میں اس وقت ہم کیا کر سکتے ہیں؟" ایلچی نے جاننا چاہا کیا۔

"فلسطین کا ایسے ہی عادتاً تذکرہ ہو گیا اور ہاں یاد رکھو طالبان کی حکومت کو آئی ایس آئی کی حکومت نہ کہنا، یہ تُم لوگوں کی اپنی حکومت ہے" بریگیڈیر نے درشت لہجے میں ایلچی سے کہا۔

"سر میرا مطلب تھا کہ ہم بھی تو آپ کے لوگ ہیں، ایک اُمہ ہیں" ایلچی نے سر جُھکا کر جواب دیا۔

"ایہناں پٹھاناں دی وی مَت ماری ہوئی اے" بریگیڈیر پنجابی میں آہستگی کے ساتھ کرنل سے مخاطب ہوا۔

اُس وقت رات کے دو بجے ہوں گے بریگیڈیر آصف، طالبان ایلچی اور کرنل عارف کے ہمراہ ایک فوجی جیپ میں سوار قندھار کے انٹرنیشنل ائیر پورٹ کا جائزہ لینے لگا جہاں صرف الباک آرمی کے جہاز ہی انٹرنیشنل فلائٹس کے طور پر اترتے تھے۔ کرنل نے غور کیا کہ طالبان کے ملیشیا اُس سرد رات میں بھی بھارتی طیارے کا گھیراؤ کئے اس کے گرد مارچ کر رہے تھے۔ دس سے بارہ جیپیں طیارے کے گرداگرد بہت ہلکی رفتار

کے ساتھ گردش کر رہی تھیں۔ اُن سے ہٹ کر مزید کچھ جیپیں پوزیشنیں سنبھالے ہوئے تھیں۔ اُن کے پیچھے دو ٹینک کھڑے تھے۔ ایلچی نے اپنی جیپ اُن جیپوں کے عین درمیان پارک کر دی۔

"یار کرنل، ہم نے انہیں کتنی جیپیں دی تھیں" بریگیڈیئر نے مزاح کے لہجہ میں کرنل عارف سے پوچھا۔

"سر جی کوئی تین درجن" کرنل بریگیڈیئر کے مزاح کو سمجھتے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ لا کر بولا۔

"یہ تو ساری جیپیں پھر اِدھر ہی لے آئے ہیں" بریگیڈیئر نے یہ کہتے ہوئے چاروں اور یوں دیکھا جیسے اُن کی گنتی شروع کر دی ہو۔

ایلچی دونوں افسروں کی گفتگو سے محظوظ ہو رہا تھا۔

سرد رات کی تاریکی میں ہلکے کُہرے کی دُھندلی چادر کے پیچھے کھڑے بھارتی طیارے کی کھڑکیوں سے مدھم روشنی دور ٹمٹماتے دیوں کی مانند نظر آ رہی تھی۔ بریگیڈیئر نے اپنی طرف کی کھڑکی کو تھوڑا نیچے کر کے باہر کے ماحول کو محسوس کرنا چاہا۔ رات کے خاموش ماحول میں گردش کرتی جیپوں کے پہیوں کی چرچراہٹ اور ملیشیا کے جوانوں کی وقفے وقفے سے کلاشنیکوفوں کو کندھوں پر بدلنے کی پریڈ کا شور بریگیڈیئر کو کسی ایسی فلم کا منظر لگ رہا تھا جس کو وہ خود فلمانے کی خواہش رکھتا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ اُسے کسی ایسی فلم کو شوٹ کرنے کا بہت شوق تھا۔ "کیا ہائی جیکر مجاہدین کو باری باری آرام کرنے کا موقع مل رہا تھا؟" بریگیڈیئر نے اپنے تصوراتی سین سے باہر آتے ہوئے سوچا۔ "جی سر، ملا شبراتی رات کے نو بجے آرام کرنے کی خاطر تب نکلے تھے جب ہمارے مجاہدین ہلکے اسنیک دینے اندر گئے تھے۔ بد قسمتی سے ہم اپنی روایتی مہمان نوازی کا مزہ اُن مسافروں کو چکھا نہیں سکتے۔ ایک تو یہ کہ یہ سبزی

خور ہمارے دُنبے بکرے کھانے سے رہے۔ دوسرا اُنہیں ہلکے سنیک ہی دیئے جا سکتے ہیں تاکہ اُنہیں بار بار پاخانے کے لئے نہ جانا پڑے" ایلچی نے اَب کی بار وضاحت سے بات سمجھانا چاہی۔

"سر، لاہور اور دوبئ کے مقابلے میں ہمارے مجاہد ہائی جیکر بہت مزے میں ہیں۔ لاہور تو اپنا ہی شہر ہے وہاں ہم اُن کی تواضع کر نہیں سکتے تھے۔ پوری دُنیا کے میڈیا کی نظریں ہم پر لگی ہوئی تھیں۔ دوبئ میں البتہ ہم نے بچوں اور کُچھ عورتوں کو اُتار دیا تھا۔ رستے میں ایک خودسر مسافر بھی مجاہدوں سے ہلاک ہو گیا تھا۔ اُس کی لاش مجاہدوں نے وہیں اُتار دی تھی ..." کرنل عارف بات کرتے کرتے رُک گیا۔ بیک وقت کرنل اور بریگیڈیئر دور کھڑے طیارے کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز پر چونکے۔

"سر، پائلٹ کو حکم ہے کہ ہر آدھ گھنٹہ بعد جہاز کے انجن کو کُچھ منٹوں کے لئے اسٹارٹ رکھے تاکہ لائٹوں اور مناسب حرارت کا نظام بحال رہے" ایلچی نے اپنی حکومت کی کارکردگی بیان کرنے کی خاطر فوری وضاحت کی۔

"خوچہ تُم طالبان لوگ بہت اسمارٹ ہو گئے ہو" بریگیڈیئر آصف نے شوخی دکھاتے ہوئے کہا۔

"سر، پنجابیوں کی نیک فوج کے ہاتھ ہماری بھاگ دوڑ ہے، ہم اسمارٹ کیسے نہ ہوں" ایلچی بھی جواباً شوخی سے بولا۔

"بائی دی وے کرنل عارف، شیخ بن لادن کا کیا حال ہے؟ کیا اُنہیں طیارے کے آپریشن کا علم تھا؟" بریگیڈیئر ایلچی کی شوخی کو نظرانداز کرتے ہوئے کرنل سے مخاطب ہوا۔

"میرا خیال ہے کہ شیخ بن لادن کو آپریشن کا علم ہو چکا ہو گا۔ سیکورٹی کے پیشِ نظر وہ بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں۔ اُن کے بارے کُچھ معلوم نہیں کہ وہ ملک کے

کس حصے میں ہیں۔ ہم میں سے کسی کی بھی اُن سے ملاقات نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ڈی جی صاحب اُنہیں خفیہ طور پر ملتے ہوں" کرنل نے وضاحت کی۔

"حضرت مُلا عمر اُن سے ملتے رہتے ہیں" ایلچی نے اپنی معلومات پیش کرنا چاہی۔

"ایہہ لبنویں بکدا اے۔ شیخ صاحب نوں ایہناں اُتے ذرا وی اعتبار نئیں۔ اوہ اپنے عرب جانثاراں دی اسکیورٹی وچ رہندے نیں" کرنل عارف نے پنجابی میں بریگیڈئیر کو اپنی رائے دی۔

"اوہ دِن دور نئیں جد تُسی تے میں دونہویں یا شیخ نوں ملاں گے" جواب میں بریگیڈئیر نے شیخ سے ملاقات کی حسرت پوری ہونے کی اُمید کرنل کو دلائی۔

*****

چوتھا باب

اغواہ شدہ بھارتی طیارے کے لئے مذاکرات

1999ء

ہائی جیکر مجاہدین کے مطالبات پر بھارت کے ردعمل کا جائزہ لینے کی خاطر طالبان شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا جس میں بریگیڈیئر آصف اور کرنل عارف بھی بیٹھے تھے۔ بریگیڈیئراور کرنل چونکہ اپنے سیل کے خودمختار نگران تھے اُنہیں اوپر سے کسی قسم کے احکامات نہ ہونے کے باوجود خود ہی احساس تھا کہ دِن کے وقت کسی صورت باہر نہیں نکلنا کہ کہیں امریکہ، روس اور چین کے سیٹلائٹ اُن کی موجودگی کو ریکارڈ نہ کر لیں۔ بند کمرے میں ہونے والے اُس اجلاس کی صدارت طالبان کے مُلا رئیسانی کر رہے تھے۔

”سر، بھارتی وزیرِ داخلہ نے فون پر مجھے خود بولا تھا کہ وہ مجاہد ہائی جیکروں کے رہنماؤں کو رہا کرنے پر تیار ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم طیارہ مسافروں سمیت بھارت روانہ کر دیں“ ملا رئیسانی نے الباکستان کے دونوں آرمی افسروں کو تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کیا۔

”آ رہے ہیں، آہستہ آہستہ راستے پر۔ مُلا صاحب! آپ اُن کو فون کر کے کہیں کہ ہائی جیکروں کا مطالبہ ہے کہ وہ کسی صورت بھی طیارے کو اُڑنے نہیں دیں گے اور وہ بھارت کو وارننگ دیتے ہیں کہ چوبیس گھنٹے کے اندراندر اُن کے تینوں بڑے قیدی

رہنما افغانستان روانہ کر دیں۔ چوبیس گھنٹے بعد مطالبہ پورا نہ ہونے کی صورت میں ہائی جیکر دھمکی دیتے ہیں کہ وہ طیارے کے عملے اور مسافروں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے" بریگیڈئیر نے انتہائی کرخت آواز میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا "ملا صاحب میں اپنی بات دُہراتا ہوں۔ آپ لکھ لیں۔ آپ نے حرف بہ حرف انہی لفظوں میں پیغام اُن کو دینا ہے، نہ کم نہ زیادہ"۔ مُلا رئیسانی 'بہت خوب، بہت خوب' کہتے ہوئے بریگیڈئیر کا آرڈر لکھنے لگا۔

اُس مختصر اجلاس کے دوران دوپہر کے کھانے کا وقفہ آ گیا جس میں بُھنے ہوئے دُنبے کے اندر اُبلتے باسمتی چاولوں اور چیری ٹماٹروں کی مہک ہر سُو پھیلی تھی۔ اُس ضیافت بھرے اجلاس میں ہائی جیکر مجاہد مُلا شبراتی خود بھی موجود تھا جو کرنل کے پہلو میں بیٹھا دُنبے کی چربی کو بُھنے گوشت کے اوپر سے ہٹا رہا تھا۔

بالآخر شام کو بھارتی حکومت کی طرف سے جواب آ گیا کہ اُن کے وزیر تینوں مجاہد رہنماؤں کو لے کر شام تک قندھار پہنچ جائیں گے۔ اُس خبر کو سنتے ہی مسافروں، طیارے کے عملے، مجاہد ہائی جیکروں، آئی ایس آئی کے خصوصی سیل اور طالبان حکومت نے شکھ کا سانس لیا۔

بھارت کا خصوصی طیارہ عین وعدے کے مطابق شام کو پہنچ گیا۔ اُس طیارے کو بھی طالبان کی بھاری ملیشیا نے گھیر لیا کہ کہیں مبادا بھارت کے کمانڈوز اُس کے اندر چھپے ہوئے ہوں۔ بریگیڈئیر اور کرنل ائیرپورٹ کے ایک خصوصی کمرے میں بیٹھے دوربینوں کی مدد سے باہر کا منظر بے تابی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

یہ خصوصی طیارہ رن وے پر ٹیکسی کرتا ہوا بالآخر اغواشدہ جہاز کے برابر آن کھڑا ہوا۔ آئی ایس آئی نے اپنی دوربینیں طیارے کے دروازے پر فوکس کر دیں۔ قندھار ائیرپورٹ کی طیارہ سیڑھی آہستہ آہستہ چلتی دروازے کے ساتھ فِٹ ہوتی نظر

آئی۔ چند منٹوں بعد دروازہ کُھلا تو بھارت کے ایک وزیر سب سے پہلے دروازے پر نمودار ہوئے۔ باہر نکلتے ہی اُنھوں نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنے غیر مسلح ہونے کا اظہار کیا۔ اُن کے پیچھے طیارے کے عملے کے دو لوگ بر آمد ہوئے اور اُن کے پیچھے مولانا اطہر مسعود نظر آئے تو مجاہد ہائی جیکر مُلا شبراتی نے بے اختیار ہو کر "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا۔ طالبان کی ملیشیا کے کُچھ جوانوں نے کلاشنیکوفیں اوپر اُٹھا کر نعرہ تکبیر بلند کیا۔ مولانا اطہر کے پیچھے برطانوی نژاد مجاہد سعید شیخ اور کشمیری رہنما مشتاق زرگر نکلے تو مولانا شبراتی کے نعروں کے ساتھ بریگیڈئیر آصف اور کرنل عارف بھی اُس بند کمرے کے اندر اللہ اکبر کی صدائیں لگانے لگے۔ افسر اَب دوربین سے اغوا شدہ طیارے کو سیڑھی لگتے دیکھنے لگے جس میں سے بقیہ چار ہائی جیکر مجاہد نعرہ تکبیر بلند کرتے اور سیڑھی پھلانگتے نیچے اُترے۔ تمام مجاہد ہائی جیکر اور بھارت سے رہا ہو کر آنے والے اعلیٰ طالبان کی ملیشیا کی دو خصوصی ٹولیوں کے ساتھ ائیرپورٹ لاؤنج کی طرف بڑھے۔ جہاں اُنھوں نے مل کر نماز ادا کی اور کسی نامعلوم سمت کی جانب روانہ ہو گئے۔ وہ دونوں افسر دوربین سے دیکھتے رہے کہ بعد میں بھارتی وزیر اور اُن کا معاون عملہ طالبان کے وزیرِ اطلاعات اور اُن کی ٹیم کے ساتھ کچھ دیر تک باتیں کرتا رہا اور آخرکار یہ لوگ اپنے طیارے کی جانب بڑھ گئے۔ اغواشدہ طیارے کے دروازے کو بھی اُنھوں نے بند ہوتے دیکھا۔ سیڑھیاں دونوں طیاروں سے ہٹا لی گئیں۔ پہلے اغواشدہ طیارہ اُس کے بعد بھارتی وفد کا طیارہ ہوا میں بلند ہوا۔ دونوں افسر دوربینیں لگائے دونوں طیاروں کو افغانستان کی فضا سے دور جاتے دیکھتے رہے۔

اِس اثناء میں طالبان کی مجلسِ شوریٰ کے ڈنر کے ساتھ خصوصی اجلاس کی تیاریاں ہونے لگیں جس میں بریگیڈئیر آصف اور کرنل عارف مُلا ریئسانی کی بھارتی وزیر سے گفتگو کا احوال سُننے کے لئے بے تاب تھے۔

قندھار سے واپس الباکستان کی جانب خصوصی طیارے پر سوار بریگیڈیر آصف خود کو محمود غزنوی کی مانند فاتح محسوس کر رہا تھا اور کرنل عارف کے ساتھ لہک لہک کر

باتیں کر رہا تھا۔ "یار اس آپریشن کا جشن منانا چاہئے"، بریگیڈیئر نے فرطِ جوش میں کہا۔ "سر کیا میڈم قاہرہ کو بولوں کہ شہر کی ٹاپ لڑکیوں کو اکٹھا کرے اور اُن کے ٹاپ لیس ڈانس کے پروگرام کا اہتمام کرے"۔ کرنل نے یہ رائے دیتے ہوئے میڈم کی گزشتہ پارٹی کی لڑکیوں کو یاد کیا جن میں سے دو کے ساتھ اُس نے ایک ہی رات میں سیکس کر کے اپنی دل کی آس پوری کی تھی۔ "ہاں یار کچھ ایسا کرنا چاہئے مگر اب کی بار جنرل چوہدری کو اس پارٹی کا پتا نہیں چلنے دیں گے۔ جنرل چوہدری تب سے کچھ زیادہ ہی مولوی ہوتے جا رہے ہیں جب سے اُن کی ملاقاتیں شیخ بن لادن سے ہوئی ہیں"، بریگیڈیر اپنی ترنگ میں بولا۔ "سر وہ تو شُکر ہے کہ ہمارے چیف صاحب یار باش آدمی ہیں، محفلوں اور پارٹیوں کے شوقین ہیں ورنہ سر جہاد کا عظیم مشن، افغانستان میں ہماری حکومت کا بول بالا، کافرستان کو کشمیر میں اپنے آگے لگائے رکھنا فقط سوکھے طریقے سے ممکن نہیں تھا۔ کبھی کبھار پارٹیوں کی رونق ضروری ہے۔ ویسے سر بڑے عرصے سے مشاعرہ نہیں ہوا۔ آپ کے گھر میں شعر و شاعری کی مُحفلیں بھی تو ہوا کرتی تھیں؟" کرنل نے بریگیڈیر کو مشاعرے کی یاد دلائی۔ "یار بس دعا کرو کہ مجھے جنرل کا عہدہ مل جائے پھر مشاعرے بھی ہوں گے اور مجرے بھی"، بریگیڈیئر نے وہسکی کا ایک لمبا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ کرنل نے خصوصی طیارے سے باہر دیکھا۔ آسمان صاف تھا اور روشن نیلی دھوپ کرنل عارف کو بھی اُس کی ترقی کی جیسے نوید دے رہی تھی۔

*****

پانچواں باب

پاکستانی جرنیلوں کی سیکس پارٹی

میڈم قاہرہ کے ساتھ چھ خوبصورت لڑکیاں آئی تھیں جنہوں نے اُن فوجی افسروں کی محفل میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔ افسروں کو اب تک یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ نیلی ساڑھی میں لپٹی سبز آنکھوں والی لڑکی کو چیف صاحب مسلسل اپنی نگاہوں کے احاطے میں رکھے ہوئے تھے۔ لہٰذا باقی پانچ افسروں نے طے کر لیا تھا کہ انہیں رات گزارنے کے لئے اپنی لڑکی کا انتخاب اُس نیلی ساڑھی میں ملبوس لڑکی کو چھوڑ کر کرنا ہو گا۔ چیف صاحب کے بعد لڑکی کے انتخاب کا حق آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل صاحب کا تھا۔ مگر اُن کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ نیلی ساڑھی میں ملبوس لڑکی سمیت سبھی کے ساتھ باری باری سیکس کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ میڈم قاہرہ پر بھی فریفتہ ہوئے جاتے تھے۔ بریگیڈیر آصف اُن میں سب سے زیادہ بے نیازی کا اظہار اس لئے بھی کر رہا تھا کہ اُسے معلوم تھا کہ آج رات افسر جس مرضی لڑکی کے ساتھ سو جائیں وہ لڑکی کل اُسے دستیاب ہو گی۔ بریگیڈیئر کا اُس رات مقصد اپنے افسروں کی خدمت کرنا تھا تاکہ اُس کے عہدے کی ترقی کے وقت افسر اُس کی خدمت گزاری کو یاد رکھیں۔ کرنل عارف خود کو ویسے ہی خوش قسمت سمجھ رہا تھا کہ چار جرنیلوں کی پارٹی میں بریگیڈیئر نے اُسے بھی شامل کیا تھا۔ اس اثناء میں شہر کے

کور کمانڈر جنرل درانی نے زیادہ شراب پی لینے کے سبب لڑکیوں کے ساتھ چھیڑخانی شروع کر دی۔ چیف صاحب نے موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے بریگیڈیئر آصف کو آنکھ کی جنبش سے مخصوص اشارہ کیا جسے بریگیڈیئر نے فوری سمجھتے ہوئے میڈم قاہرہ کے کان میں ہولے سے کچھ کہا۔ میڈم اُٹھی اور جنرل درانی کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔ ''سر، میں آپ سے دوسرے کمرے میں ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں''۔ جنرل درانی میڈم قاہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے جھولتے ہوئے اُٹھے۔ میڈم کی آنکھ کے اشارے سے پنک شلوار قمیض میں سکڑی بیٹھی ایک دوشیزہ اُٹھی اور میڈم کے پیچھے چلتے اُس وسیع و عریض ڈرائنگ روم کو عبور کرنے لگی۔ بریگیڈیئر نے کرنل کو تلقین کی کہ وہ تینوں جنرل صاحبان کو ڈرنک بنا کر دے اور لڑکیوں سے کہے کہ وہ ڈانس کی تیاری کریں۔ محفل میں موجود سب افسروں کو اندازہ تھا کہ یہ محفل بہت نجی، خفیہ اور پرائیویٹ قسم کی تھی جس میں فوج کے اردلیوں کو خدمت کے لئے نہیں بلایا گیا تھا۔ کھانے سے پلانے تک اور ڈانس سے عریانی تک کا سارا کام بریگیڈیئر اور کرنل نے اپنے ذمہ لیا ہوا تھا۔ رنگ رلیوں والی اس محفل کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی گئی تھی۔ بریگیڈیئر آصف لارڈ گنگٹن کے اس تاریخی محل کو اس قسم کی پارٹیوں کے لئے استعمال کرتا تھا جس کے دس عالیشان بیڈ روم ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پر تھے اور ہر بیڈ روم میں بپا ہونے والے ہنگامے کا دوسرے بیڈروم والے کو علم نہیں ہوتا تھا۔ اُدھر میڈم قاہرہ جیسے ہی جنرل درانی کو ایک بیڈ روم میں لے کر گھسی تو جنرل نے میڈم قاہرہ کو اُس کے پستانوں سے پکڑنا چاہا۔ میڈم قاہرہ نے انتہائی مہارت اور شائستگی کے ساتھ جنرل کے ہونٹوں کو چومتے ہوئے پنک شلوار کرتے میں ملبوس لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ''سر آپ کے لئے آج خاص تحفہ ہے'' لڑکی کو دیکھتے ہی جنرل درانی کی باچھیں جیسے کھل اُٹھیں۔ ''تم بھی ادھر ہی رک جاؤ'' جنرل نے وہسکی کی بو میں جیسے التجا سی کی۔ ''سر، میں بھی واپس آؤں گی''۔ یہ کہہ کر وہ دروازے کو پیچھے سے بند کرتے ہوئے نکل گئی اور سوچنے لگی کہ ٹھگنے قد کے اس

جنرل کے ساتھ سیکس کرنا کافی پیچیدہ کام ہے۔ میڈم قاہرہ آج بریگیڈیئر آصف کے ساتھ سونے کی نیت رکھتی تھی مگر ایک جنرل کے نہ آنے کے سبب اب ایک لڑکی زیادہ تھی۔ "لہٰذا ہو سکتا ہے کہ مجھے آج خالی ہی بیٹھنا پڑے کیونکہ ساری لڑکیوں کو کام پر لگانا مقصود تھا"۔

میڈم جب واپس پارٹی روم پہنچی تو کرنل عارف ڈی جے نما موسیقی لگانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اور پانچوں لڑکیاں کسی مقامی سینما کی فلمی جھلکی کی طرح مغربی انداز کا ڈانس کر رہی تھی۔ قاہرہ کو واپس آتے دیکھ کر چیف صاحب نے آنکھ کی جنبش سے اُسے پاس بلایا۔ "تمہیں اندازہ ہے کہ کسے میرے کمرے میں ابھی پہنچنا چاہئے؟" چیف صاحب نے میڈم سے سرگوشی کے انداز میں جاننا چاہا۔ "سر، شاید وہ نیلی ساڑھی والی؟" میڈم نے داد لینے کے انداز میں اپنا اندازہ بتایا۔ "گڈ، وہی اور ساتھ کوئی بھی دوسری تم اپنی مرضی سے بھیج دینا، تمہاری طرف سے بلائنڈ ڈیٹ سمجھوں گا" چیف صاحب کی مونچھوں کے اوپر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ "آل رائٹ سر، میری تو ضرورت نہیں؟" میڈم نے جواب دیتے ہوئے مزید وضاحت چاہی۔ "تمہارے ساتھ پھر کبھی ملاقات ہوگی" چیف صاحب یہ جملہ انتہائی آہستگی سے کہہ کر چپکے سے اُٹھے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ کرنل، بریگیڈیئر اور میڈم قاہرہ کو اندازہ تھا کہ چیف صاحب کے جانے کے پندرہ منٹ بعد اُن کی مرضی کی لڑکی کو اُن کے کمرے میں پہنچنا چاہئے۔ اُن پندرہ منٹوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آج کی بقیہ رات کی پلاننگ کی خاطر بریگیڈیئر میڈم قاہرہ کے ساتھ والی کرسی پر ایک لمبی جست لگا کر پہنچا۔ "چیف صاحب کو کون سی لڑکی چاہئے؟" بریگیڈیئر نے پوچھا۔ "انہیں دو لڑکیاں چاہیں، نیلی ساڑھی والی اور دوسری کوئی بھی، میں سوچتی ہوں کہ لہنگے والی لڑکی کو بھیج دوں" قاہرہ نے دبے لفظوں میں کہا۔ "لہنگے والی لڑکی کو تو میں اپنے لئے سوچ رہا تھا" بریگیڈیئر نے جیسے یہ بات چھیڑ خانی کے انداز میں کہی۔ "خبردار بریگیڈیئر، اگر تم نے میرے علاوہ کسی کے بارے سوچا۔" میڈم قاہرہ نے غصے کے ساتھ اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم تو بالکل میری بیوی کی طرح بولنے لگی ہو"

بریگیڈیئر صورتحال سے جیسے محظوظ ہو رہا تھا۔ "ہاں مجھے تُم اپنی بیوی ہی سمجھو، مگر یاد رکھو کہ مجھے یعنی تمہاری بیوی کو چیف صاحب بھی اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے اور ان دو جرنیلوں کی بھی میرے بارے میں مانگ ہو سکتی تھی۔ مگر کوشش کرنا کہ یہ دونوں افسر باقی تین لڑکیوں میں سے کسی دو کو لے جائیں اور آخر میں بچ جانے والی ایک لڑکی تمہارے کرنل کے ساتھ سوئے گی۔" میڈم نے موسیقی کے شور میں پورا پلان بریگیڈیئر کو دیا۔ بریگیڈیئر اس پلان اور پروٹوکول کی روشنی میں پہلے ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی کی کرسی کے ساتھ والی خالی کرسی پر بیٹھا اور اپنے ہونٹ اُن کے کان کے قریب لے جا کر پوچھنے لگا "سر اُس سبز قمیض، پیلی ساڑھی اور کاسنی غرارے میں سے کون سی لڑکی کو آپ کے کمرے میں بھیجوں؟" "اوہ تمہارا مطلب یہ ہے کہ وہ نیلی ساڑھی والی اور پنک لہنگے والی چیف صاحب کے پاس جا رہی ہیں؟" ڈائریکٹر جنرل نے شرارتاً معلومات لینا چاہیں۔ بریگیڈیئر کوئی جواب دینے کی بجائے مسکرایا۔ "ٹھیک ہے، پھر اپنے کنٹری کے جھنڈے کے رنگ میں لپٹی اُس ہری جوانی کو بھیج دو" انہوں نے لڑکی کی طرف باقاعدہ اشارے کرتے ہوئے کہا۔ "سر، میں کرنل سے کہتا ہوں کہ وہ آپ کو آپ کے کمرے تک لے جائے" بریگیڈیئر نے اس کے ساتھ ہی کرنل کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ "یار، وہی کمرہ اچھا ہے جو تُم نے مجھے پچھلی پارٹی میں دیا تھا اور تمہیں پتا ہے کہ میں زیادہ شراب وراب نہیں پیتا، بس ایک گلاس وائن کافی ہے۔ کمرے میں البتہ گرم کافی ہونی چاہیے۔ میں اس سبز جوانی کے ساتھ ساری رات جاگنا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر ڈائریکٹر جنرل کرنل کے ساتھ پارٹی روم سے باہر نکل گیا۔ ڈی جے موسیقی مسلسل چل رہی تھی اور لڑکیاں اپنے اپنے پارٹنر کو جانے بناء ہی ناچ رہی تھیں۔ ڈی جی صاحب کے پارٹی روم سے نکلتے ہی بریگیڈیئر جنرل قاسم کے ساتھ والی خالی کُرسی پر بیٹھ گیا۔ "جنرل قاسم اُس کو اپنے ساتھ بیٹھتے دیکھ کر شرارتی نظروں سے مسکرائے اور اُس کے بولنے سے پہلے ہی بول اُٹھے، "اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ چیف اور ڈی جی کے بعد میرے لئے کون بچی ہے؟"

"سر وہ پیلی ساڑھی والی اور کاسنی غرارے والی" بریگیڈیئر نے جنرل قاسم کے لئے چوائس چھوڑی۔ "پھر دونوں ہی بھیج دو، تم اور کرنل دونوں مل کر اس میڈم کو سنبھال لینا۔ پچھلی بار جب یہ میڈم میرے ساتھ تھی تو میں نے جان لیا تھا کہ اس کو سنبھالنا اکیلے بندے کا کام نہیں" یہ کہتے ہوئے جنرل قاسم نے اپنی تیکھی مونچھوں کے اوپر تیکھی سی مسکراہٹ کو پھیلایا۔ "جی سر، جو فرمائیں" بریگیڈیئر نے اس بات کو جانتے ہوئے جواب دیا کہ جنرل قاسم میڈم کی ایک لڑکی کو بھی سنبھال لے تو بڑی بات ہے۔ "اچھا چھوڑو اس مذاق کو، کاسنی لہنگے والی کو بھیج دو، مجھے عورت کا لہنگا اُتارنے میں زیادہ مزہ آتا ہے" جنرل قاسم نے جیسے ہی اپنی پسند کے بارے بتایا، کرنل پارٹی روم میں واپس آچکا تھا۔ بریگیڈیئر کے اشارے پر کرنل جنرل قاسم کو اُس کا کمرہ دکھانے اپنے ساتھ لے گیا۔ پارٹی روم سے جرنیلوں کے چلے جانے کے بعد پیچھے میڈم قاہرہ اور بریگیڈیئر رہ گئے تھے اور اُن کے ساتھ ڈی جے کی موسیقی میں ڈانس کرنے والی پانچ لڑکیاں تھیں۔ چھٹی لڑکی پہلے ہی مدہوش جنرل درانی کے ساتھ بھجوا دی گئی تھی۔ میڈم نے ڈانس کرتی لڑکیوں میں سے نیلی ساڑھی اور پنک شلوار قمیض والی دونوں لڑکیوں کو بازو سے پکڑ کر الگ کیا اور اُن دونوں کو کچھ سمجھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکالا اور اُن کو چیف صاحب کے کمرے کی طرف لے گئی۔ جب میڈم اُن دونوں لڑکیوں کو کمرے سے باہر لے کر نکل رہی تھی تو کرنل پھر پارٹی روم میں واپس لوٹ رہا تھا۔ بریگیڈیئر نے اُس کو اشارے سے اپنی طرف بلایا اور کاسنی غرارے والی کو تینوں سے الگ کرتے ہوئے کرنل کے حوالے کیا اور بتایا کہ وہ اُسے جنرل قاسم کے کمرے میں چھوڑ آئے۔ خود وہ سبز قمیض والی کو لے کر ڈی جی صاحب کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ کرنل، میڈم اور بریگیڈیئر تینوں ایک ہی وقت میں لڑکیاں جرنلوں کے کمروں میں چھوڑنے کے بعد واپس پہنچے تو اس جہازی سائز کے پارٹی روم میں پیلی ساڑھی والی اکیلی لڑکی ڈی جے موسیقی پر ہنوز ناچ رہی تھی۔ صبح میڈم قاہرہ نے کپڑے پہنتے ہوئے بریگیڈیئر سے گلہ کیا کہ تم فوجی افسر لڑکیوں کی عصمت دری کی فیس اچھی نہیں دیتے۔ میڈم نے چوٹی کے سیاستدانوں،

بیوروکریٹس، زمینداروں اور جاگیرداروں کا موازنہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اُن کی ہیرے جیسی لڑکیوں کو ہیروں سے لاد دیتے ہیں مگر جرنیلوں کی طرف سے کبھی کچھ نہیں ملتا۔ "دیکھو سویٹی، فوجی افسروں کی خدمت کرنا تمہاری پلٹون کا فرض ہے، یہ جو تم چند ہزار روپے مجھ سے لے رہی ہو یہ میری جیب سے ہیں۔ جرنیلوں سے میں ایک ٹکا نہیں لے سکتا۔ سمجھو، یہ تمہاری حفاظت کے لئے ہیں۔" بریگیڈیئر نے اُسے حوصلہ دیا۔ "وہ تو میں سمجھتی ہوں مگر لڑکیوں کو میں اپنی جیب سے دیتی ہیں، تُم مجھے آئی ایس آئی سے کیوں فنڈز نہیں دلاتے؟" میڈم نے اُسے رستہ دکھلایا۔ "میں ڈی جی صاحب سے بات کروں گا، آئی ایس آئی کا جو ڈیپارٹمنٹ صحافیوں کو پیسے دیتا ہے، کوشش کروں گا اُسی ڈیپارٹمنٹ سے تمہارا بھی مہینہ لگوا دوں" بریگیڈیئر نے اُس کے گال چومتے ہوئے حامی بھری۔

٭٭٭٭٭

چھٹا باب

الباکستان کا پریس ڈیپارٹمنٹ اور شاعری

ابا جی کے فوت ہونے کے بعد اُن کی دو نسبتاً کم سن معشوقائیں آئی ایس پی آر کے اسپیچ رائٹر حسن مختار کے حصہ میں آئی تھیں۔ حسن کے ابا جی کا جرمنی میں ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور وہی پر وہ اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ اُن کے انتقالِ پُر ملال کی خبر جب سب سے پہلے ٹوئٹر کے ذریعہ ماڈل ٹاؤن لاہور میں مقیم اُن کے خاندان تک پہنچی تو حسن کی اماں جی اعتکاف میں بیٹھی ہوئی تھیں اور بڑے بھائی جان علیم ابا جی کی سب سے مشہور محبوبہ جو کہ ٹی وی کی معروف اداکارہ تھیں کے ساتھ مری کے ہوٹل میں ہم بستر تھے جس کا علم صرف حسن کو تھا، البتہ علیم کی بیوی کو شک تھا۔ حسن سوچنے لگا کہ کیسے بھائی صاحب کو ابا کے انتقالِ پُر ملال کی اطلاع دی جائے کیونکہ اُن کا موبائل فون بند تھا اور ہوٹل کے ٹیلی فون پر کال کر کے وہ بھائی جان کے دورے کو بدمزہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اِدھر سب اُس مخمصے میں بھی تھے کہ اماں جی کو اطلاع کی جائے یا نہ کی جائے کیونکہ ایک طرف تو سب اُن کے اعتکاف کو توڑنا نہیں چاہتے تھے اور دوسری طرف اُنہیں بروقت اطلاع نہ پہنچا کو گستاخی کے بھی مرتکب نہیں ہونا چاہتے تھے۔ خیر طے یہی پایا کہ اماں کو اعتکاف پورا کر لینے دیا جائے۔ اِس بات کا فیصلہ حسن کی دونوں بہنوں اور بھابھی نے مل کر کیا۔ اِس دوران ابا کی ایک کمسن معشوقہ کا فون حسن کے موبائل پر آگیا جو ابا کی وساطت سے پہلے ہی حسن کے رابطہ میں تھی۔ اُس نے خبر ٹوئٹر سے ہوتی ہوئی بی بی سی اُردو ڈاٹ کام پر کہیں پڑھ لی تھی۔ اُسے ابا کی صحبت کے

ساتھ ساتھ حسن کی صحبت بھی ستا رہی تھی۔ حسن نے اُسے حوصلہ دیا اور یقین دلایا کہ وہ اُسے کسی صورت بھی ابا کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔ اُس نے رقت بھری آواز میں ابا کی اُن مہربانیوں کا اعتراف کیا جن کی بناء پر وہ ایک ٹی وی چینل پر اپنا شو شروع کرنے میں کامیاب ہوئی تھی مگر اَب اُسے اِس بات کا قلق تھا کہ اُس نے ابھی ابا سے کالم نگاری کا فن سیکھنا تھا۔ حسن نے اُسے فون پر پورا یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ اُس کے لئے ابا کی ہر کمی کو پورا کرے گا۔ تھوڑی دیر بعد ابا کی دوسری نوخیز معشوقہ کا فون آگیا جو ابا کی سفارش سے ایک کالج میں لیکچرار بھرتی ہوئی تھی۔ وہ حسن سے یہ یقین دہانی چاہ رہی تھی کہ کیا وہ اُسے شاعری کے اوزان سکھا دے گا جس کا عہد و پیمان ابا نے اُس کے ساتھ کر رکھا تھا۔ حسن نے اُسے بھی یقین دلایا کہ وہ مکمل طور پر اُس کا اور اُس کی غزلوں نظموں کا لب ولہجہ درست رکھے گا۔ ابا کا جرمنی میں ایک مشاعرے کے دوران ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ بعد میں اطلاعات ملیں کہ وہ مہمانِ خصوصی ہونے کے ناطے اپنا کلام پیش کرنے کی باری کا انتظار کر رہے تھے کہ دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ اتنی دیر میں جرمنی میں متعین الباکستان کے سفیر شفقت شیخ کا فون آگیا۔ انہوں نے حسن سے اظہارِ تعزیت کیا اور جاننا چاہا کہ اس کے ابا کی میت کو کس طرح واپس بھیجے، نیز وہ حسن سے یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کیا وہ خود میت کو وصول کرنے جرمنی آنا چاہے گا۔ حسن نے بتایا کہ اُس نے اسلام آباد کے جرمن سفارتخانے سے ویزہ لینے کی خاطر فوج کے تعلقاتِ عامہ کے ذریعے درخواست بھیج دی تھی اور توقع ہے کہ کل ویزہ ملتے ہی وہ جرمنی پہنچ جائے گا۔

اگلے روز جرمنی روانگی سے پہلے ملک کے صدر، چیف آف دی آرمی اسٹاف، وزراء اور سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں کے تعزیتی پیغامات ملے۔ حتّٰی کہ وزیر اعظم کے بغیر چلنے والے ملک کے معزول وزیر اعظم کا بھی حرم شریف سے تعزیت کے لئے فون آگیا۔ اباجی کی کالم نگاری اور شاعری کی دھاک کے ساتھ ساتھ اُن کی وجہ شہرت دو آرمی جرنیلوں اور تین وزراء اعظم کے اسپیچ رائٹرز کی مختصر ٹیم کا حصہ ہونا بھی تھا۔ ابا

جی نے مرحوم جنرل ضیاء کی چند یادگار تقریریں لکھی تھیں۔ اس سے پہلے وہ بھٹو صاحب کی دو انقلابی تقریریں لکھنے کی شہرت بھی پا چکے تھے۔ پھر انہوں نے حالیہ معزول وزیر اعظم کے لئے اُس دور میں چند تقریریں لکھی تھیں جب وہ وزیراعظم تھے۔ حتیٰ کہ بعد میں وزیراعظم کو معزول کرنے والے جنرل اشرف کی بھی پہلی تقریر لکھنے کا انہیں شرف حاصل ہوا تھا۔ حسن کو اباجی کے انتقالِ پرملال کے بعد آنے والی تعزیتی فون کالوں اور پھر اُن کی معشوقاؤں کی آہ زاریوں سے اپنے مرحوم والد کی بلند قامت شخصیت کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اُسے آج رہ رہ کر یاد آ رہا تھا کہ مرحوم باپ نے کمالِ بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے فوج کے تعلقاتِ عامہ میں بھرتی کروایا تھا جہاں وہ اُن کی رہنمائی اور اپنی صحافیانہ صلاحیتوں کی بناء پر خوب کامیاب ہوا تھا۔ جرمنی کی فلائٹ پر سوار باپ کی میت کو وصول کرنے کے خیال سے اُس کا جی بھر آیا۔ ساتھ ساتھ یہ اُمنگ بھی ابھری کہ اباجی کی طرح اُسے بھی صدر اور وزیراعظم کے لئے تقریریں لکھنے کا موقع ملنا چاہئے۔ اُسے اچانک محکمہ فوج کے شعبہ تعلقاتِ عامہ کی طرف سے جاری کردہ اپنی پریس ریلیزز پھیکی محسوس ہونے لگیں۔

جرمنی میں الباکستان کے سفارتی عملے نے اُس کا ائیرپورٹ پر استقبال کیا اور اُس کو اُس کے ہوٹل تک پہنچا دیا۔ اُسے یاد آرہا تھا کہ ہوٹل جاتے ہی اُس نے ریڈ بک کی ڈائریکٹری کی مدد سے ایک کال گرل کو فون کر کے بلایا۔ جب وہ آئی تو وہ سر پیٹ کر رہ گیا۔ وہ ایک پینسٹھ سالہ فربہ عورت تھی۔

اگلی صبح وائس آف جرمنی اُردو سروس کے انٹرویو کے دوران حسن کل رات موٹی پینسٹھ سالہ طوائفہ کے ساتھ پھیکے زنا کی بدمزگی کو حلق سے ٹانگوں تک محسوس کر رہا تھا۔ اتنے میں انٹرویو کرنے والے ایک نوجوان صحافی نے عجیب بے ڈھنگا سا سوال کر دیا۔ کہنے لگا، ''آپ کے والد محترم دنیا بھر میں اُردو مشاعرے پڑھنے جاتے تھے مگر انہوں نے بھی بیشتر اُردو شاعروں کی طرح کسی ملک کے مقامی ادیبوں سے ملنے کے

لئے کبھی تردد نہیں کیا تھا، سو میرا سوال یہ ہے کہ اُردو شاعر مغربی ممالک میں صرف پاکستانی کمیونٹی کے پیچھے مشاعرے پڑھنے کیوں آتے ہیں؟ ”نہیں ایسا ہر گز نہیں، میرے والد محترم کی اطالوی، انگریز، عرب اور ڈینش ادیبوں کے ساتھ ملاقاتوں کی کئی تصویریں ہمارے پاس موجود ہیں۔شاید آپ کو اس حقیقت کا علم نہیں۔“ اپنے جواب میں یہ آخری جملہ کہتے ہوئے حسن کو خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں یہ بدتمیز انٹرویو نگار کہیں اُردو شاعروں کے مشاعروں کے کاروبار سے ہٹ کر شاعروں کے زنا کرنے کے شوق پر کہیں کوئی سوال نہ پوچھ بیٹھے۔

انٹرویو کے بعد وائس آف جرمنی اُردو سروس کا نوجوان صحافی جلیل احمد اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے الباکستان سے آنے والے صحافیوں، شاعروں اور ادیبوں کی سوچ کے بارے سوچنے لگا کہ وہاں سے آنے والے بیشتر اپنے آپ کو حکیم الامت سمجھتے ہیں۔ یہ سب اپنے آپ کو اسلام اور الباکستان کی محبت میں ڈھوبے قرار دیتے تھے اور اپنی حرکتوں سے پرلے درجے کے لوفر، جھوٹے، عیاراور اسلام والباکستان کو بیچ کر کھا جانے والے ہوتے تھے۔ الباکستان سے آنے والے سرکاری وفود میں شامل بیوروکریسی، سیاسی لیڈر شپ اور آرمی افسران کے بارے بھی اُس کا مشاہدہ کم و بیش ایسا ہی تھا۔ انٹرنیٹ کی فراوانی، سوشل میڈیا کی بھرماراور جرنلزم سے وابستہ ہونے کے ناطے اُس کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہر لحہ الباکستان کی سیاست سے جڑا ہوا تھا۔ اُردو سروس میں کام کرنے کی وجہ سے اُس کو وہاں کے سرکردہ لوگوں کو لائیو لینا ہوتا تھا اور اکثر بار وہ اُن سے تیکھے سوال کر بیٹھتا تھا جس پر اُس کا ایڈیٹر اُس سے اُلجھتا رہتا تھا۔ اِسی طرح کی باتیں سوچتے ہوئے وہ ابھی اپنی کافی ختم نہ کر پایا تھا کہ اُس کے ایڈیٹر کافون آگیا۔ ”جی سر“ اُس نے باس کا فون لیتے ہوئے کہا۔ ”بھائی میرے کچھ خیال کر لیا کرو، تمہارے بارے آئی ایس پی آر کے افسر خوش نہیں، حسن صاحب تمہارے بارے شکایت کر رہے تھے“ ایڈیٹر نے برہم ہو کر کہا۔ ”سر مجھے یہ بتائیں، ہماری نیوز سروس حکومتِ الباکستان کی ہے، ہم تو جرمن نیوز سروس ہیں، ہمیں اپنے انداز

میں کام کرنا چاہئے، ہم آئی ایس پی آر یا آئی ایس آئی سے تو تنخواہ نہیں لیتے" جلیل بھی بحث کے موڈ میں تھا۔ "دیکھو بھائی تم نے تو شاید وہاں نہیں جانا مگر میرے بچے اُدھر ہی رہتے ہیں۔ چھوڑو اس بات کو بھی۔ ہم الباکستانی افسروں کے ساتھ زیادہ بگاڑ نہیں سکتے، ہمارا کچھ عملہ بھی وہاں پر ہوتا ہے۔ مجھے آج دوپہر کو ملو، ہمیں اس مسئلہ پر سنجیدہ بات کرنا چاہئے" یہ کہہ کر ایڈیٹر نے فون بند کر دیا۔ 'سالا کہیں کا، آئی ایس آئی کا پٹھو، اُن سے پیسے لیتا ہے' جلیل فون رکھنے کے بعد بڑبڑایا۔

☆☆☆☆☆

ساتواں باب

دہشت گردی کے خلاف جنگ کا آغاز

11 ستمبر 2001 کے دن بون جرمنی میں دوپہر کا وقت ہوا تھا جب امریکہ میں جہاز ٹاور بلڈنگوں اور پینٹاگون کی عمارت سے ٹکرائے اور ایک جہاز پینسلوانیا کے کھیتوں میں جا گرا۔ یورپ میں یہ وہی دوپہر تھی جس کی صبح جلیل احمد نے حسن کا انٹرویو کیا تھا اور بعد ازاں ایڈیٹر سے فون پر منہ ماری ہوئی تھی۔ ابھی اُس نے کافی کا کپ رکھا ہی تھا کہ سامنے ٹی وی پر ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی عمارتیں جلتی اور گرتی دکھائی جا رہی تھیں۔ 'اوہ میرے خدایا' اُس نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔ وہ فوراً اپنے کمرے سے باہر نکل کر یہ جاننے کے لئے مرکزی عمارت کی طرف بھاگا کہ جرمنی میں تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ جیسے ورلڈ وار شروع ہو گئی تھی۔ اُس کا مدیر جو تھوڑی دیر پہلے اُسے دوپہر کو ملنے کی تلقین کر رہا تھا وہ بھی نیچے کو بھاگ رہا تھا۔ اُس پر نظر پڑتے ہی وہ اُس سے مخاطب ہوا، 'دیکھا تم نے امریکہ پر حملہ ہو گیا ہے، چلو جرمن صحافیوں سے پوچھتے ہیں'۔ باہر اپنی براڈ کاسٹ کمپنی کی پارکنگ لاٹ میں آکر وہ خود کو گم سُم محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے مدیر پر ایک نگاہ ڈالی جو بے چینی کے ساتھ سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اُس کے کالر پر سگریٹ کے جلنے کا تازہ تازہ نشان تھا۔

"لگتا ہے کہ روس یا نارتھ کوریا نے امریکہ پر ایٹمی حملہ کر دیا ہے، امریکہ میں ہر طرف بلڈنگیں جل رہی ہیں..." مدیر اپنی کمنٹری کر رہا تھا اور جلیل اُس کے

چھوٹے قد، منحنی شخصیت اور دیہاتی پنجابی خدوخال کو خالی الذہن دیکھے جا رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر زمین میں دھنسی ایک بینچ پر مارگریٹ سر نیچے کی طرف جھکائی بیٹھی ہوئی تھی جیسے یا تو کسی گہرے صدمے میں ہو یا پھر دنیا کی ہر بات سے بیگانہ ہو۔ اتنے میں مارٹن جرمن زبان میں بڑبڑاتا اُن کے پاس آیا۔ "امریکہ پر اسلامی دہشت گردوں نے حملہ کر دیا ہے"۔ وہ بڑبڑاہٹ کے بعد بڑے تیقن سے انگریزی میں بولا۔ "تمہیں کس نے بتایا" مدیر نے جھنجھلا کر پوچھا۔ "امریکی میڈیا بول رہا ہے"، مارٹن نے انہیں شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "ضرور کوئی سازش ہو گی، چلو کمرے میں چل کر ٹی وی دیکھتے ہیں" مدیر جلیل سے مخاطب ہوتے ہوئے واپس اوپر کی منزل کو بھاگا۔ کئی لوگ تیزی سے سیڑھیاں اُترتے نظر آئے جیسے وہ اس بات کا یقین کرنا چاہ رہے ہوں کہ جرمنی ایسے حملوں سے محفوظ ہے۔ جلیل مدیر کے کمرے میں بیٹھا ٹی وی ریموٹ کو ہاتھ میں لئے چینل پر چینل بدل رہا تھا۔ دونوں ٹاوروں کے جلنے اور دوسرے جہاز کے گھسنے کی ویڈیوز چل رہی تھیں۔ ٹھیک سے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اصل ماجرا کیا تھا۔ امریکہ کے صدر بُش فلوریڈا میں بچوں کے ایک اسکول سے خطاب کرتے ہوئے ورلڈ ٹریڈ سنٹرز میں دو جہاز ٹکرانے کی اطلاع دُنیا کو دیتے دکھائی دیے۔ دونوں ٹاورز جل رہے تھے، اُن کی منزلیں ایک گہرے دھوئیں میں گر رہی تھیں۔ جلیل کے لئے یہ اندوہناک منظر دیکھنا دوبھر ہو رہا تھا۔

امریکیوں نے حملے کے روز اُسامہ بن لادن کو اس حملے کا ذمہ دار قرار دے دیا۔ اسامہ بن لادن کے چھپنے کے حوالے سے الباکستان کا نام بھی خبروں میں آنے لگا۔ الباکستان میں 9/11 کی خبر پہنچتے ہی خوشی کے شادیانے سے بجنے لگے۔ اندرون لاہور بٹوں کے ایک محلہ میں حاجی شاد بٹ نے کھسروں کے ناچ کا بندوبست کرتے ہوئے لڈو اور چائے کا انتظام کیا۔ مولوی فہیم نے حاجی شاد بٹ کی دعوتِ عام کی قبولیت کے لئے دعائے خیر بھی پڑھی۔ اس موقع پر صداقت ہیجڑے نے شیخ بن لادن کے لئے جان

کے ساتھ ساتھ اپنی پیٹھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے بھی شیخ پر وار کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ مولوی فہیم نے دعا کے دوران صداقت ہیجڑے کی پیٹھ کا بغور جائزہ لیا۔ گلی کی نکر پر سلیمان دہریا بھی حاجی شاد کے لڈوؤں اور چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور امریکہ کو صلواتیں سناتے ہوئے صداقت ہیجڑے کی پیٹھ کے ساتھ پیٹھ ملا کر ناچنے لگا۔ حاجی شاد کی نظر سلیمان دہریا کی پیٹھ پر تھی۔

11/9 کے روز شیخ اُسامہ کی نئی بیوی سے ایک بچہ پیدا ہوا اور شیخ کی پہلی بیوی کے بڑے بیٹے نے اپنی منگیتر سے شادی رچائی۔ یہ سب کچھ شیخ کی فیملی میں پہلے سے طے تھا۔ البتہ 11/9 کی خوشخبری اُن پر بھاری پڑ رہی تھی کیونکہ اتنی بڑی کارروائی اور کامیابی کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ شیخ کا بچہ سانحہ سے چند گھنٹے قبل افغانی وقت کے مطابق پیدا ہوا تھا جس کی داغ بیل اگرچہ آٹھ ماہ اور اٹھائیس روز پہلے رکھی گئی تھی۔ اسی طرح شیخ کے بیٹے کی سگائی بھی تین مہینے چار روز پہلے طے کی گئی تھی۔ البتہ 11/9 کی منصوبہ بندی کی تاریخ منصوبہ بنانے والوں کو یاد نہیں تھی۔ اس منصوبہ بندی کے لئے کئی میٹنگز کی گئی تھیں مگر وہ سب منصوبے تب خیالی سمجھے جا رہے تھے۔ کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا بھرپور حملہ ہو گا۔ کئی سالوں سے شیخ عبد الرحمن اور ایمن الزواہری ایسے منصوبے سوچ رہے تھے مگر اُن کے خیالوں خوابوں میں بھی شاید نہیں تھا کہ اتنی بڑی کامیابی ہو گی۔ 11/9 کی خبر ملتے ہی آئی ایس آئی نے افغانستان کے امیر ملا عمر کو خبردار کر دیا کہ کسی طور اس واقعہ پر خوشی کا اظہار نہ کرے بلکہ اس کی مذمت کرے۔ نیز شیخ لادن سمیت القاعدہ کے کسی رہنما کا کوئی بیان پریس تک نہ جائے بلکہ شیخ کی طرف سے اس واقعہ کا مذمتی نوٹ جاری کیا جائے۔ آئی ایس آئی کی مزید ہدایات تھیں کہ شیخ سمیت القاعدہ کے لیڈر تورا بورا سے نکل جائیں کیونکہ کسی وقت بھی امریکہ کی طرف سے حملہ ہو سکتا تھا۔ نیز امریکہ کے دباؤ اور پیسے کے لالچ میں آکر طالبان یا الباکستان آرمی کا کوئی دستہ بھی حملہ کر سکتا تھا۔ شیخ لادن اپنے جان نثار عرب دستوں کے ساتھ

تورا بورا کی غاروں سے نکل کر وزیرستان کی طرف بھاگے۔ ابھی سانحہ 9/11 کی مزید خبریں آرہی تھیں، امریکہ میں دن کا وقت تھا۔ اسلام آباد میں سی آئی اے اسٹیشن الباکستانی حکام اور افغانستان میں طالبان حکومت کی نقل وحرکت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شام تیزی سے رات میں ڈھل رہی تھی۔ اس تاریکی اور امریکہ کی بوکھلاہٹ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے شیخ لادن کسی محفوظ مقام تک پہنچ گئے۔ اُن کی جواں سال بیوی ایک نومولود بچے کے ساتھ باحفاظت کہیں اور پہنچا دی گئی تھی۔ اُن کا نوبیاہتا بیٹا اور بہو کہیں اور پہنچ گئے۔ باقی خاندان کے افراد بھی مختلف حفاظتی مقامات پر عارضی طور پر پہنچا دیئے گئے۔

امریکی وقت کے مطابق 11 ستمبر کی رات اور افغانستان کے وقت کے مطابق بارہ ستمبر کی صبح تورا بورا کی غاروں کے آس پاس کویت سے اُڑ کر امریکی طیاروں نے افغانستان پہنچ کر شدید گولہ باری کی۔ امریکہ نے اپنے غم و غصہ اور خفت کے جواب میں حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ الباکستان آرمی، جنرل اشرف اور آئی ایس آئی نے امریکی ردعمل کو لمحہ بہ لمحہ جانچنا شروع کر دیا۔ جنرل اشرف نے اگلے روز کور کمانڈرز کا ایک اجلاس بلایا اور الباکستان میں موجود معاشی بحران کی طرف جرنیلوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ 9/11 ہمارے لئے ایک لاٹری ثابت ہوسکتی ہے۔ ہم امریکہ سے بلینز ڈالرز لے کر دہشت گردی کے خلاف اُس کے اتحادی کے طور اپنا آپ بھی بچا سکتے ہیں۔ نیز اچھے طالبانوں کو ساتھ ملا کر بُرے طالبانوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ البتہ شیخ لادن ہمارے لئے سونے کی چڑیا ہیں۔ اُن کو کسی صورت امریکہ کے ہتھے چڑھنے نہیں دینا۔ جب تک وہ زندہ رہیں گے، ہمیں امریکی امدادیں ملتی رہیں گی اور امریکہ کشمیر میں ہماری کارروائیوں پر بھی انگلی نہیں اٹھائے گا۔ جرنیلوں کو جنرل اشرف کی ساری باتیں سمجھ آرہی تھیں البتہ آخری بات سے تو سبھی نے اپنے منہ سکیڑ کر اور کندھے اُچکا کر اتفاق کیا۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ کی پارٹنر شپ کی بنیادی باتیں طے کرنے میں امریکی اور الباکستانی حکام میں کچھ دن لگے۔ جب بنیادی باتوں اور لین دین کے معاملات طے ہو گئے تو جنرل اشرف نے امریکہ کے ساتھ مل کر دہشت گردی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ آئی ایس آئی اور دیگر حساس اداروں کے حساس افسران کو اندازہ تھا کہ اس جنگ میں کس سے لڑنا ہے اور کس کو بچانا ہے البتہ عام فوجیوں اور عوام کو جذبہ ایمان اور جذبہ ضرورت کا صبح و شام سبق دیا جانے لگا۔

*****

2002ء

کرنل عارف کو جب امریکی صحافی ڈینئیل پرل کے قتل کی اطلاع ملی تھی تو اُسے ہرگز حیرت نہ ہوئی تھی کیونکہ شیخ سعید کے ارادوں کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ ٹی وی خبروں کے مطابق ڈینئیل پرل مولانا گیلانی کے انٹرویو کے لئے نکلا تھا مگر راستے میں اغوا ہو گیا تھا۔ کرنل کو 1999 کی وہ شام یاد تھی جب شیخ سعید مولانا اظہر اور زرگر کے ساتھ بھارتی حراست سے آزاد کروایا گیا تھا۔ کرنل اس نوجوان کی بہادری کا قائل تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ نوجوان آئی ایس آئی کا انمول اثاثہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ شرارتی نوجوان تشدد بھرے جہاد کی راہ میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس نوجوان کی سرگرمیوں کے تانے بانے یورپ امریکہ سے ہوتے ہوئے افغانستان اور ہندوستان تک پھیلے ہوئے تھے۔ کرنل عارف کو یہ بھی اندازہ تھا کہ یہ جذباتی و جہادی نوجوان مغربی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ہاتھوں بھی ماضی میں استعمال ہوا تھا مگر آئی ایس آئی نے اس کو بھرپور انداز میں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا تھا۔ کرنل کو بھی دو بار شیخ سعید سے ملنے کا موقع ملا تھا، اُسے آج یاد آرہا تھا کہ دونوں بار اُس سے ملاقات کے دوران کرنل کو شیخ سعید کی چلبلی طبیعت پسند آئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اُس کا جذبہ جہاد بھی دل کو لگا تھا۔ کرنل نے شیخ سعید کے دیسی اسلامی مزاج میں برطانوی پرورش کے امتزاج کو بہت

پسند کیا تھا۔ کرنل کو یہ انداز بہت اچھا لگا تھا کہ شیخ سعید برطانیہ میں پلنے بڑھنے کی وجہ سے گوروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تھا اور اُن کو اپنے برطانوی لہجے کی وجہ سے چکمہ بھی دے لیتا تھا۔ آئی ایس آئی کے کام کے سلسلہ میں برطانیہ کے متعدد چکر لگانے کی وجہ سے کرنل شیخ سعید اور وہاں کے کچھ الباکستانی نژاد لارڈوں کی کشمیر کمپیئین اور برطانوی حکومت میں لابنگ کا بہت قائل تھا۔ کرنل کو الباکستان کے کشمیر، افغانستان اور دیگر جہادی ایجنڈوں میں پاکستان سے باہر الباکستانیوں سے زیادہ مدد ملتی تھی۔ پاکستان میں ان جہادی کارروائیوں کو آگے بڑھانے کے لئے سیاسی اور مذہبی جماعتوں پر بہت پیسہ خرچ کرنا پڑتا تھا جبکہ لندن اور امریکہ سے الباکستانی کمیونٹی کے افراد اپنی چوہدراہٹ اور مذہبی جنونیت کے چکر میں خود ہی فنڈ اکٹھے کر لیتے تھے۔ البتہ شیخ سعید جب سے براہ راست آئی ایس آئی کے رابطے میں آیا تھا اُس کے تمام پراجیکٹس کا خرچہ آئی ایس آئی ہی اٹھاتی تھی۔ ڈینئیل پرل کے قتل پر کرنل کا خیال تھا کہ اس میں آئی ایس آئی سے زیادہ شیخ سعید کی اپنی مرضی اور پلاننگ تھی مگر کرنل کا یہ بھی خیال تھا کہ شیخ سعید کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آئی ایس آئی کے کسی شعبے نے مدد ضرور کی ہو گی۔ ڈینئیل پرل کے قتل کے کچھ مہینوں بعد جب کراچی میں ایک بس پر خود کش حملے کی اطلاع کرنل کو ملی تھی جس میں گیارہ فرانسیسی ہلاک ہوئے تھے۔ اس حادثے کو القائدہ سے جوڑنے کی اطلاعات بھی آئی تھیں مگر کرنل کو یقین تھا کہ اس حملے کا تعلق الباکستان فرانس کے مابین آبدوزوں کی کمیشن ڈیل کے تنازعہ سے تھا۔ جب اُسے اس حملہ کی اطلاع ملی تھی تب وہ حال ہی میں جنرل اشرف کے ریفرنڈم سے فارغ ہوا تھا۔ ریفرنڈم کے بعد اُس الیکشن کی تیاریوں میں اچھا خاصا مصروف ہو گیا تھا۔ الیکشن کے نتیجہ میں میں جنرل صدر اشرف کو اپنی مرضی کی ایک اور حکومت بنانا تھی۔ جس کو اکتوبر 2002 میں صدر اشرف کرنل عارف اور بریگیڈئیر آصف جیسے ہونہار افسروں کی مدد سے بنانے میں کامیاب رہا تھا۔

*****

آٹھواں باب

الباکستان کے نئے ٹی وی چینلز

2002-2005ء

دہشت گردی کے خلاف اعلانِ جنگ کے ایک سال کے اندر اندر ملک بھر میں ٹی وی اسٹیشنوں کا ایک جال بچھنا شروع ہو گیا۔ اس رنگین روح پرور کام کے لئے بریگیڈئیر آصف اور کرنل عارف کو ایک بار پھر بہت ساری ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ ٹی وی اسٹیشنوں کی لائسنسنگ کے لئے جہاں چند ایک بڑے اخبارات کے مالکان کو چُنا گیا وہاں یورپ اور دبئ میں ہنڈی کا کاروبار کرنے والے ایسے بزنس مینوں کو بھی ڈھونڈا گیا جن کی مدد سے دُنیا بھر میں پیسے کے لین دین کو آسان بنایا جا سکے۔ بریگیڈئیر آصف نے ٹی وی چینلوں کو اداکارائیں اور مرضی کی نیوز اینکرز فراہم کرنے کی بھی مدد کی۔ اگر کہیں کہیں ٹی وی چینلوں نے اچھی قابل لڑکیوں کو اپنے طور سے بھرتی کرلیا تو بریگیڈئیر نے اُن کا بایو ڈیٹا اکٹھا کرنے میں دیر نہ لگائی۔ بریگیڈیئر اور کرنل نے مرد اینکروں کی اسلامی اور الباکستانی شناخت کو بہت احتیاط سے جانچا پرکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے سیاسی مبصرین کی کھیپ تیار کرنے میں بھی ابھرتے ہوئے چینلوں کی مدد کی۔ بریگیڈئیر نے اس احتیاط کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا کہ تمام سیاسی پارٹیوں کے ایسے نمائندوں کو ٹاک شوز کے لئے تیار کیا جائے کہ وہ اسٹیبلشمنٹ کے ایجنڈے کا ہمیشہ خیال رکھیں اور ساتھ ساتھ کہیں کہیں کھل کر اپنی پارٹی کے موقف کو بھی اس طرح پیش

کریں کہ عوام لطف اندوز ہوں اور میڈیا میں کھل کر بات کرنے کا تاثر پیدا ہو۔ 2002 سے 2005 تک ایک درجن سے زائد ٹی وی چینلز سامنے آ گئے۔ افغانستان میں جاری دہشت گردی کی جنگ کے خلاف امریکہ کے مرکزی کردار کی بناء پر اچھا خاصا پیسہ الباکستان جانے لگا، امریکی کاروبار بھی وہاں پر کھلنے لگے جو نئے چینلوں کی آمدن کا ذریعہ بنے۔ طالبان کے خلاف پروپیگنڈا مہم کے ضمن میں بھی میڈیا کو مغربی ممالک کی کمپنیوں کی بالواسطہ مدد ملنے لگی۔ اُدھر سے آئی ایس آئی امریکی امداد میں سے کچھ رقم نکال کر اُن صحافیوں اور میڈیا ہاوسز کو دینے لگی جو امریکہ کے خلاف پرپیگنڈا کا کام کرنے لگے۔ الغرض مملکتِ الباکستان کا کام چلنے لگا۔ کرنل عارف اُن تمام صحافیوں کا کام تمام کرنے پر مامور ہو گئے جو آئی ایس آئی کے طالبان کے ساتھ خفیہ روابط کو آشکار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بریگیڈیئر آصف مغربی سفارت کاروں، صحافیوں اور انٹرنیشنل کارپوریشنوں کے سرکردہ افراد کے رابطے پاکستان میں بننے والی نئی طوائف کمپنیوں سے بناتے۔ ان نئی کمپنیوں کی لڑکیوں کے ہوشربا نخش پوز دیکھتے ہوئے بریگیڈیئر آصف کو اپنے لڑکپن کے شوق یاد آتے۔ اُسے 1985 جون کی ایک دوپہر یاد آ رہی تھی جب وہ سترویں سال کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی کوٹھے کو پھلانگ کر ثریا کو چومنے گیا تھا جو اس کے چومتے ہی بیہوش سی ہو کر سامنے لیٹ گئی تھی اور اُسے پہلے پہل سمجھ نہیں آئی تھی کہ وہ اس جیتی جاگتی لاش کا کیا کرے۔ اُنہی گرمیوں کی دوپہروں میں ایک دن وہ ثریا کے کوٹھے کے پچھلے چوبارے میں اُس کے ساتھ لیٹا اُس کی چوما چاٹی کرتے اور چھاتیاں ملتے اگلے مرحلے کی خود میں ہمت اور واقفیت نہ پاتے فرسٹریشن کا شکار ہو رہا تھا کہ اچانک ثریا کی بڑی بہن حمیدہ نے چھاپہ مار دیا۔ 'اٹھو حرام زادو اور چل گشتی تو تو نیچے چل' وہ جھاڑو لے کر اُس کے پیچھے بھاگی۔ ثریا دالان پھلانگتی ہوئی نیچے بھاگی۔ وہ اپنے کوٹھے کی طرف سرکنے لگا تو حمیدہ نے اُس کو شلوار سے پکڑ لیا۔ "تو کہاں جاتا ہے چھوکریا"، یہ کہتے ہی اُس نے اپنے ہونٹ اُس کے ہونٹوں سے کس دیئے۔ "میرے ساتھ لیٹا کر، میں تمہیں سب کچھ سکھا دوں گی، یہ کہہ کر حمیدہ نے اُس کی شلوار کا ناڑہ کھینچتے ہوئے اُس کو ننگا کر دیا اور اُسے نیچے لٹا کر اُس کے اوپر بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھ سے اُس کا ٹٹولتے ہوئے

اُسے عملی طور پر بے آبرو کرنے میں کامیاب ہو گئی"۔ بریگیڈیئر آصف کو وہ دوپہر یاد آنے پر یاد آ رہا تھا کہ کس طرح پہلی بار وہ عورت کے اندر گھسا تھا۔ بعد میں وہی حمیدہ اور ثریا اپنے گرم جسموں کی وجہ سے خوب چلیں۔ وہ غربت کی ماری ہوئی نہیں تھیں، اُن کے باپ حاجی وارث کا اچھا خاصہ کاروبار تھا۔ انہوں نے بیٹیوں کی کاروباری حلقوں میں شادیاں کر دیں مگر دونوں ٹھیک ٹھاک شوقین تھیں۔ اُنہیں مردوں کا شوق تھا، پہلے وہ پیسوں کے بغیر ہی چلتی تھیں، پھر پیسے بھی لینے لگیں مگر اس طرح کے فحش پوز وہ نہیں بناتیں تھیں جس طرح آج کل کی ماڈرن طوائفیں بناتی تھیں۔ 'شاید یہ گوریوں سے سیکھتی ہیں' بریگیڈیئر نے پورنو فلموں کے سین ذہن میں دہراتے ہوئے سوچا۔ اُسے جنرل صاحب کی بات یاد آئی جو انہوں نے ایک پرائیویٹ محفل میں کہی تھی کہ 'دل لبھانے کے لئے ہمیں شریف عورتوں کی اداؤں کی ضرورت نہیں بلکہ ایسے پوزوں کی ضرورت ہے'۔ جنرل صاحب بھی جہاندیدہ شخصیت تھے جو ملکی ترقی کے غرض سے اس کو سیکولر اسٹیٹ بنانے کے لئے تُلے ہوئے تھے مگر ساتھ ساتھ ملکی سالمیت کی خاطر اسلام کے علمبردار گڈ طالبان کی بھی پشت پناہی کرتے رہتے تھے۔ خدا الپاک افواج کا حامی و ناصر ہو۔ بریگیڈیئر آصف کے دل سے اپنی آرمی کے لئے دُعا نکلی۔ بیڑہ غرق ہو سیاستدانوں کا جو ملکی خزانہ لوٹ کر کھا گئے۔ جنہوں نے بینکوں سے اربوں ڈالرز چرائے، اپنے خاندانوں کے لئے ملوں کے انبار لگا دیئے۔ سارے ملک کی زمینوں پر قبضے کر لئے۔ ان کا واقعی ہی محاسبہ ہونا چاہئے۔ بریگیڈیر نے سوچا۔ خود بریگیڈیئر نے دو پلاٹ بیچ کر اپنے بچوں کو امریکہ پڑھنے کے لئے بھیجا تھا۔ جہاں اُس کا بیٹا اور بیٹی پارٹ ٹائم نوکریاں کرتے ہوئے محنت کے ساتھ ماسٹرز کر رہے تھے جن کے بارے اُس کی دلی خواہش تھی کہ وہ وہیں پر رہیں اور یہاں کے گندے ماحول میں واپس نہ آئیں۔ بریگیڈیئر گاہے گاہے اپنی زندگی کے اوراق پلٹتا رہتا تھا، کس طرح کی رنگ رلیوں والے لڑکپن سے فوج کی حالیہ رنگ رلیوں میں رہنے کے باوجود بیوی نیک ملی، اولاد نیک ملی۔ اُس کی فوجی رنگ رلیاں کبھی بھی اُس کی ذاتی زندگی پر اثرانداز نہ ہوتی تھیں کیونکہ اُس کی فوج کی زندگی

پر اُس کے خاندان والے اُنگلی تک نہ اٹھاتے تھے کیونکہ وہ ملک و قوم کی خدمت کے لئے معمور تھا۔ اسی لئے وہ اس اعلیٰ عہدے تک پہنچا تھا۔

جنرل اشرف نے وہسکی کا گلاس چڑھانے کے بعد بریگیڈئر آصف سے باقی انتظامات کے بارے پوچھا۔ ”سر وہ انگلینڈ سے پاکستانی بیوٹی کوئن آئی ہوئی ہے، آپ کی پرستار بھی ہے“۔ جنرل صاحب مزید کچھ کہے بغیر گیسٹ ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ فوجی صدارتی محل میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ چھ سینئر بیٹ مین جنرل رانی سے لے کر بیوٹی کوئن کے تذکرے کرتے ہوئے چٹخارے لے رہے تھے۔ الٰہی بخش خانساماں باورچی خانے کی صفائی کر چکنے کے بعد باہر سگریٹ پھونکتا ہوا سوچ رہا تھا کہ خداوند کریم نے انسان کو بھی کس طرح عورت اور مرد کی شکل میں بنایا ہے اور اُن کی آپس میں کشش بھی کیا چیز ہے۔ اُسے اپنی دونوں بیٹیاں یاد آئیں اور اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اُس کی ایک بیٹی کو ایک کیپٹن نے قتل کر دیا تھا اور دوسری بچہ جنتے ہوئے اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ مہ پارہ کو اُس جوان سال کیپٹن سے محبت ہوگئی تھی جس کی کوٹھی کے کوارٹر میں الٰہی بخش بطور خانساماں بھرتی ہوا تھا۔ الٰہی بخش کے لئے وہ خبر بجلی بن کر گری جب اُسے پتہ چلا کہ اُس کی بیٹی حاملہ ہو گئی ہے۔ کیپٹن نے الٰہی بخش کو بلا کر مشورہ دیا کہ بہتر ہے کہ مہ پارہ اپنا حمل گرا دے۔ ”صاحب، آپ تو غیر شادی شدہ ہیں، اُسے اپنے نکاح میں لے لیں“، الٰہی بخش نے التجا کی۔ ”تمہارا دماغ درست ہے، میری شادی تو اپنے چچا بریگیڈیئر صلاح الدین کی بیٹی سے اگلے مہینے طے ہے“ کیپٹن دھاڑا۔ مہ پارہ نے حمل گرانے سے انکار کر دیا۔ الٰہی بخش نے پہلی بار اپنی بیٹی پر ہاتھ چلاتے ہوئے آنسوؤں کی جھری کو روکا اور مرحومہ بیوی کو یاد کیا۔ اس واقعہ کے تیسرے روز اُسے مہ پارہ کی لاش کیپٹن کے ڈرائینگ روم سے ملی۔ آرمی پولیس نے کیپٹن کو گرفتار کر لیا۔ دوسال بعد الٰہی بخش کو پتہ چلا کہ کیپٹن کے بریگیڈیئر چچا سُسر نے اپنے بھتیجے کو کورٹ مارشل سے بچا لیا تھا۔ الٰہی بخش اپنے آنسوؤں کو روکتے اور دوسرا سگریٹ پھونکتے باورچی خانہ کی کھڑکی سے دور چلا گیا اور صفیہ کو یاد کرنے لگا جو پچھلے

برس نرسنگ ہوم میں اپنی جاب کے دوران دردِزہ کا شکار ہوئی اور وہی پر بچہ جننے کے دوران فوت ہو گئی تھی۔ اُس کا شوہر ایک نیک دل فوجی اردلی تھا۔ اب اُس کا شوہر اور اُس کے والدین صفیہ کے بیٹے کو پال رہے تھے۔ جن سے ملنے وہ گاہے گاہے چلا جاتا تھا اور اپنے نواسے کے ساتھ کھیلتے ہوئے اُس کے آنسو ایک تو بیٹیوں کو یاد کرتے ہوئے نہ رُکتے تھے اور دوسرا اپنے داماد اور اُس کے خاندان کے لوگوں کے حسنِ سلوک کی شکر گزاری کے احساس کے بوجھ تلے جھکنے کی وجہ سے بھی نہ رُکتے تھے۔اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ دُنیا میں ایسے اچھے لوگ بھی ہیں اور دُنیا میں ایسی بے بسی بھی نہیں ہے۔ الٰہی بخش باورچی خانہ کے پچھواڑے اس لان میں اپنی یادوں اور غموں کو ہلکا کرنے کے بعد بیٹ مینوں کی محفل میں واپس لوٹا تو وہی افسروں کے بارے چٹخارے دار خبریں چل رہی تھیں۔ ان خبروں میں بغیر حصہ لئے اپنے دوستوں کے لئے چائے بناتے ہوئے سوچنے لگا کہ اتنے بڑے افسروں کے بڑے بڑے راز راز بھی نہیں تھے۔

”انسان مٹی کا پُتلا ہے، بلکہ تماشاہے“ افسانہ نگارنے حلقہ اربابِ ذوق اسلام آباد کے اجلاس میں حاضرین کی توجہ پہلی لائن سے ہی حاصل کرتے ہوئے افسانہ جاری رکھا۔ ”ایک لمحے وہ ایک سفاک جانور ہے، مگر دوسرے لمحے وہ جذبات کا پُتلا ہے اور پھر کسی اور لمحے سادھو بن جاتا ہے۔ خود کو چست و چوبند پائے تو دُنیا فتح کرنے نکل پڑتا ہے اور ذرا ڈھیلا محسوس کرے تو مٹی کے ڈھیلے کی طرح ڈھ جاتا ہے...“ لکھنے والے کا افسانہ چل رہا تھا کہ کرنل عارف بور ہو کر باہر نکل آیا اور سوچنے لگا کہ وہ تو بیکار ہی اس ادبی محفل میں آیا۔وہ تو اس بات کا سراغ لگانے آیا تھا کہ کہیں اس محفل میں کچھ ادیب طالبان اور اشرف حکومت کے گھٹ جوڑ کے بارے من گھڑت کہانیاں تو نہیں لکھتے، کیونکہ اُسے اس بات کی بھنک پڑی تھی مگر وہاں تو افسانہ نگار کو افسانہ ہی لکھنا نہ آتا تھا بلکہ افسانے کے نام پر مضمون پڑھ رہا تھا۔ کرنل نے تنقیدی انداز میں سوچا۔ اُسے خیال آیا کہ ان ادیبوں سے تو وہ صحافی کئی درجہ ذہین ہیں جنہیں وہ اور بریگیڈیئر آصف نئے ٹی وی چینلوں کے لئے تیار کر رہے تھے۔

*****

نوواں باب

الباکستان اور امریکہ کی آگے بڑھتی شراکت داری

2006ء

"سر ہر قوم اپنے مفاد کے لئے کام کر رہی ہے، امریکی اپنے مفاد کی خاطر ہمیں امداد دیتے ہیں مگر ہم امریکیوں کی خاطر اپنے طالبان اور مجاہدین کا قلع قمع نہیں کر سکتے۔ یہ طالبان اور مجاہدین افغانستان اور کشمیر میں ہمارے جہاد کے ساتھی ہیں"، جنرل شاہد نے کور کمانڈر میٹنگ میں جنرل اشرف اور باقی کور کو یاد دلایا۔ "جنرل شاہد کی کسی بات سے انکار نہیں، ہم امریکی دباؤ کی وجہ سے حافظ سعید، شیخ اُسامہ اور مولانا اظہر جیسے خاص لوگوں کو وقتاً فوقتاً چھپا تو سکتے ہیں لیکن اُن کو امریکہ کے حوالے کسی صورت نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنے سے ہمارا اپنا لائن آف ایکشن برباد ہو کر رہ جائے گا۔" جنرل حامد نے جنرل شاہد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "میں بالکل اس بات کو سمجھتا ہوں، میں کل واشنگٹن میں صدر بُش کے ساتھ ملاقات کے دوران الباکستان کی طرف سے امریکہ کا بھرپور ساتھ دیتے رہنے کا عزم دہراؤں گا۔ مگر ایک بات ہم سب کو یاد رکھنی چاہئے کہ اس وقت امریکہ القاعدہ کے خاتمے اور شیخ اُسامہ کی گرفتاری میں بہت بے صبرے پن کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس لئے آپ سب اپنی حرکات و سکنات میں بہت احتیاط برتیں۔ جن جن اہم لوگوں کو چھپا کر رکھنا ہے، اُس میں احتیاط برتیں۔ بے شک مجھے یا ایک دوسرے کو بھی نہ بتائیں۔ مجھے معلوم ہے جب میں صدر بُش، سی آئی اے کے سربراہ

اور پینٹاگون کے جرنیلوں سے ملوں گا تو مجھ پر آپ سب پر نظر رکھنے کے بارے بھی بہت دباؤ آئے گا، خاص طور پر جنرل محمود، آپ پر اور آپ کے ادارہ پر بہت انگلیاں اُٹھیں گی"۔ جنرل اشرف نے آئی ایس آئی کے سربراہ کی طرف انگلی اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "سر، ہم اسلام آباد سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کو بہت پھونک پھونک کر ڈیل کر رہے ہیں اور اُن کی بے جا حرکتوں کو سیکیورٹی کے ڈراوے دے کر محدود کرتے رہتے ہیں" جنرل محمود نے وضاحت کی۔ "بس اُن کو مصروف رکھو"، جنرل اشرف نے یہ مشورہ دے کر اجلاس ختم کر دیا۔ جنرل اشرف گھر جاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ 'جہاں ایک طرف امریکیوں کو طالبان، القاعدہ اور الباکستان آرمی کی غیر متوقع حرکتوں سے ڈرانا چاہئے وہاں خود اپنے ساتھی جرنیلوں اور آئی ایس آئی کو امریکی غیظ وغضب سے بھی ڈرانا ضروری ہے تاکہ کل کلاں کو ان میں سے چند جرنیل مل کر میرا پتہ صاف نہ کر دیں'۔

جس دن جنرل اشرف صدر بش اور پینٹاگون سے مل رہا تھا اُسی دن باجوڑ میں القاعدہ کے ایک کیمپ پر بھرپور حملہ ہوا جس میں القاعدہ کے کچھ مقامی لیڈر مارے گئے۔ شیخ اُسامہ نے ایمن الزواہری کے ذریعے طالبان کی ہائی کمان سے جاننا چاہا کہ آخر جنرل اشرف ڈبل گیم کیوں کھیل رہا تھا؟ کیا وہ امریکہ کو دکھاوے کی خاطر ہمارے لوگ مار رہا تھا؟ یا پھر درحقیقت اندر ہی اندر ہماری ٹوہ میں بھی تھا؟ طالبان نے جواب میں لاعلمی کا اظہار کیا تو ایمن الزواہری نے واضح طور پر کہا کہ اگر کوئی مزید حملہ ہمارے لوگوں پر ہوا تو ہم جنرل اشرف اور الباکستان آرمی پر جہادی حملے شروع کر دیں گے۔ مُلا عمر نے پیغام بھجوایا کہ ایسا ہرگز نہ کیا جائے کیونکہ جنرل اشرف اور الباکستان کے دیگر جرنیل تو چاہتے ہیں کہ اُن کے خلاف القاعدہ ایسا فتویٰ دے تاکہ اُن کا اقتدار مضبوط ہو اور امریکہ کی مزید امداد ملے۔

جنرل اشرف کے حالیہ دورہ پینٹاگون کے بعد تین امریکی جرنیل الباکستان اور افغانستان سے آنے والی خبروں کی روشنی میں جنرل اشرف کی باتوں کی باڈی لینگویج کا

تجزیہ کر رہے تھے۔ جنرل ولیمز کا خیال تھا کہ جنرل اشرف انتہائی مکار اور گھٹیا شخص تھا، جنرل اسکاٹ جنرل ولیمز کا ہم خیال تھا اور اُس کا کہنا تھا کہ اُن کے پاس جنرل اشرف اور الباکستان آرمی کے ساتھ کام کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔ جنرل ویلڈن کے مطابق جنرل اشرف القاعدہ کے خاتمے کے لئے اپنی کوششوں میں مخلص دکھائی دیتا تھا۔

میڈم قاہرہ کو آج اپنی دو جگری سہیلیاں بابرہ اور ببلی یاد آ رہی تھیں۔ ایک عرب شہزادے کے ساتھ بیاہی جا چکی تھی اور دوسری امریکہ ہجرت کر گئی تھی۔ دونوں کے ساتھ چائے پینے اور گپیں لگانے کا مزہ ہی کچھ اور تھا، اُس نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اُنہیں یاد کیا۔ آج میڈم اپنے لان میں اکیلی بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اتنے میں اُس کا پپی کاؤں کاؤں کرتا چڑیوں کو پیڑوں سے اُڑاتا اندر سے آن وارد ہوا۔ میڈم نے پپی کے بے ہنگم شور کو نظر انداز کرتے ہوئے بابرہ اور ببلی کی شخصیت کا آج کی لڑکیوں سے موازنہ کرنا چاہا تو اُسے اُداسی بھری تنہائی کا احساس ہوا۔ اُسے یاد آیا کہ بابرہ کو بھی گاڑی اور اچھی کوٹھی پسند تھی مگر اُسے شاعری، مہذب لڑکے، اچھی گفتگو، وائن اور اچھا میوزیک روپے پیسے کی باتوں سے ہٹ کر اچھے لگتے تھے۔ وہ ہمیشہ ایسے گاہکوں کے ساتھ وقت گزارتی تھی جو گاہک کم اور قدردان زیادہ ہوتے تھے۔ میڈم کو یاد نہیں آتا تھا کہ آج تک کسی چھچھورے شخص نے اُسے چھوا بھی ہو۔ وہ نودولتیے سیاستدانوں، قبضہ گروہوں اور پولیس افسروں سے دور رہا کرتی تھی۔ آخر کار وہ ایک قطری شہزادے کے عقد میں چلی گئی تھی۔ اب کئی سالوں سے یا تو وہ قطر رہتی تھی یا پھر کبھی کبھار انگلینڈ چلی جاتی، اُس کے پاس ایک بنگلہ کراچی میں بھی تھا۔ ببلی کا البتہ کوئی خاص اچھا حال نہیں تھا۔ وہ دھندے سے زیادہ سماجی گھٹن سے تنگ آکر امریکہ چلی گئی۔ وہاں شادی ناکام ہوئی مگر ذیابیطس اور دل کی تکلیف نے اُسے نڈھال کر رکھا تھا۔ پھر بھی وہ کیلیفورنیا کے سمندر سے خوش تھی۔ میڈم کو یاد آ رہا تھا کہ جب کبھی وہ مل بیٹھتی تھیں تو کیسی خوشگوار باتیں کرتی تھیں جو آج کی ہمجولیوں کے ساتھ ممکن نہ تھیں۔ آج کی لڑکیاں ہر وقت زیور، کوٹھیوں، پلاٹوں اور پلازوں کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ سب

میڈیم کو کہتی تھیں کہ وہ بڑے بڑے پیسے والوں سے اُن کو متعارف کروائیں۔ پیسا بھی اب ایسے ایسے گنواروں کے پاس تھا کہ اُن سے بات کرتے ہوئے میڈم کو گھن آتی تھی۔ میڈیم کے ذہن کے ساتھ ساتھ اُس کا پپی بھی شور مچا رہا تھا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی تو دیکھا ایک مشہور ٹی وی اینکر کا فون تھا۔ "بیوی کو میری ماڈل سنبل کے ساتھ ہونے والی شادی کا علم ہو چکا ہے"، وہ گھبرایا ہوا تھا۔ "چن جی، یہ کون سی ایسی بڑی بات ہے، تُم نے شادی ہی کی ہے نا، اللہ رسول کے کہنے کے مطابق، کسی کے ساتھ حرام تو نہیں سوئے" میڈم نے چسکہ لیتے ہوئے مذہب کا تڑکا لگایا۔ "میری بیوی کہتی ہے کہ تم حرام سو لیتے، اُس کی خیر تھی مگر میں سوتن کو گھر نہیں گھسنے دوں گی" وہ بولا۔ "تو سوتن کو آج کل گھر کون گھسنے دیتا ہے، وہ تو میں بھی گھسنے نہ دوں، اُس کو نیا گھر تو تُم نے لے کر دیا تھا"۔ میڈم نے مزید چسکہ لیا۔ "وہ تو نئے گھر میں ہی ہے لیکن آپ کو میں فون اس لئے کر رہا ہوں کہ وہ اپنے پرانے بوائے فرینڈز کو بُلا لیتی ہے، ماڈلنگ کا شوق بھی پورا کرنا چاہتی ہے جو مجھے پسند نہیں۔ اُس کو میں نے سب کچھ دیا ہے، اُسے سمجھائیں کہ ایسی حرکتوں سے باز رہے، آپ کو پتہ ہے میرے کتنے تعلقات ہیں، وہ باز آئے اس سے پہلے کہ میں اُسے سیدھا کروں۔" اینکر ذرا دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ "باؤ جی، آپ باز آئیں۔ آپ کو شاید پتہ نہیں کہ سنبل اور اُس کی ماں کے آپ سے بھی زیادہ تعلقات ہیں۔ آپ ذرا اپنے ہوش ٹھکانے رکھیں، اس سے پہلے کہ سنبل کا کوئی عاشق ایس ایچ او، کسی قبضہ گروہ کا سُرغنہ یا ریاراہ چلتا طالبان آپ کو فارغ کرے، آپ ذرا مجھے ملنے آئیں اور میں آپ کو سمجھاؤں کہ بڑے افسروں سے تعلق داری کے زعم میں کہیں چھوٹے افسروں کے ہاتھوں نہ مارے جائیں۔" یہ کہہ کر میڈم نے غصے سے فون بند کر دیا۔

*****

2006ء

بریگیڈیئر آصف کو ایک بڑے میڈیا ہاؤس میں دعوت دی گئی تھی جہاں تین درجن سے زائد اسکرپٹ رائٹرز، شاعر، ادیب اور کالم نویس اُس سے ملوائے جا رہے تھے۔ اُن میں سے چار خاتون شاعرات نے اپنے شعری مجموعے اُس کو پیش کئے جن کے بارے اُس نے اپنے طور پر ہی طے کر لیا تھا کہ ان شاعرات کو یقیناً کسی نے شاعری لکھ کر دی ہو گی۔ اُس نے سوچا کہ جب یہ خواتین سب کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کریں گی تو اُن کے منہ سے نکلے لفظوں کی بنیاد پر اُن کی قابلیت کو پہچان لے گا۔ جب میڈیا ہاؤس کا ایم ڈی سب کا تعارف کروا رہا تھا تو بھی بریگیڈیئر آصف سب کی باڈی لینگویج دیکھ رہا تھا۔ ملک کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے یہ شاعر ادیب زیادہ تر دیہاتی رویے اپنی چال ڈھال پر سموئے ہوئے تھے۔ شروع کے تین چار لوگوں کے بیباک خیالات اُسے اچھے لگے۔ پھر ایک شعری مجموعے کی خالقہ ایک شاعرہ کی باری آئی جو بہت پینڈو انداز کے ساتھ شہری اَپر کلاس سے تعلق رکھنے کی ایکٹنگ کر رہی تھی، اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے منہ کھولا تو بریگیڈیئر کو یقین ہو گیا کہ اس کی شاعری کی کتاب کسی تھڑکی شاعر نے لکھی تھی جو ہو سکتا تھا کہ اسی محفل میں موجود ہو۔ اُس پہلی خاتون شاعرہ نے اپنا نام بتانے کے بعد بریگیڈیئر آصف اور میڈیا ہاؤس کے ایم ڈی کی شان میں تین چار اوٹ پٹانگ جملے کہتے ہوئے اپنی نگاہیں بریگیڈیئر پر ہی مرکوز رکھیں۔ بریگیڈیئر کا جی چاہ رہا تھا کہ اُس کے شعری مجموعے کے ابتدائی چند اوراق پر نگاہ دوڑائے تاکہ اندازہ کر سکے کہ اُس کے لئے شعر لکھنے والا خود بھی کوئی بہتر شاعر تھا یا نہیں۔ بریگیڈیئر آصف کو اپنے شعری ذوق پر ناز تھا۔ اپنے ذوق پر ہی ناز کا احساس کرتے ہوئے دوسری شاعرہ نے اپنا تخلص 'ناز' بتایا۔ اُس نے اپنے تعارف کے طور پر اپنا شعر بے وزن پڑھا تو بریگیڈیئر یہ سوچ کر مسکرایا کہ یہ اوریجنل شاعرہ ہو سکتی تھی جس نے بے وزن شعر کو درست نہیں کروایا۔ وہ اپنے شعر کو بے وزن پڑھنے کے بعد جس طرح کی اوچھی حرکتیں کر رہی تھی اُس سے بریگیڈیئر کو خیال آیا کہ یہ عورت بازار کی بھی نہیں

مگر اس کی حرکات وسکنات بازار سے بھی گئی گزری تھیں۔ بریگیڈیئر نے جب اُس کی طول ہوتی بے ہنگم تقریر پا ناک منہ چڑایا تو ایم ڈی نے شکریہ کر کے مائک اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔ البتہ تیسری اور چوتھی شاعرات اپنی بات چیت میں ڈھنگ کی لگیں۔ اُن شاعرات کے بعد پھر مرد حضرات کی باری آگئی۔ میانوالی سے تعلق رکھنے والا ایک کالم نویس بہت ہی خوش آمدیدی نکلا۔ لاہور کا ایک مشہور شاعر اپنے لہجے میں بدتمیز لگا۔ کوئٹہ کے اسکرپٹ رائٹر پر بریگیڈیئر نے خصوصی توجہ دی کیونکہ وہ بلوچستان سے دو تین مصنفین ڈھونڈ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

دسواں باب

الباکستانی سیاست نائن الیون کے بعد

2007ء

"تم کو تو انڈیا کی انٹیلی جنس 'را' پیسے دیتی ہے۔ 'را' کی مدد سے تم لوگوں نے شہر کو برباد کر دیا ہے۔ تم لوگ اس ملک کو توڑنا چاہتے ہو"، سندھی اجرک اوڑھے ڈاکٹر ودیا کمار نے اپنے دوست امام رضوی اور اُس کی پارٹی پر بالآخر کھل کر الزام لگا دیا"۔ امام رضوی نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار کئے بغیر مسکراتے ہوئے ڈاکٹر ودیا کمار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کہا۔ "ڈاکٹر صاحب، الباکستان کی ہندواقلیت سے تعلق رکھنے کی وجہ سے آپ کو سب سے زیادہ انڈیا اور را کے خلاف بات کرنے کی مجبوری میری سمجھ میں آتی ہے۔ میں الباکستانیوں کی طرح ایک ہندو شہری کو شک کے نیزے پر نہیں رکھوں گا مگر آپ کو بتانا چاہوں گا کہ میرا تو ذاتی طور پر جی چاہتا ہے کہ انڈیا ہماری مدد کرے مگر اُن کی طرف سے مدد نہیں ملتی"۔ "رضوی صاحب، آپ کی بات بھی درست ہے۔ ہم الباکستانی ہندوؤں کے پاس اس کے علاوہ چارہ بھی کوئی نہیں۔ آج تک انڈیا نے ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ انڈیا کو بھی پاکستان کی ہندو برادری میں مخبروں کی ضرورت ہے، ہماری مدد کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ دوسرا انڈیا اور الباکستان کے بیچ کشیدگی کا ہمیشہ سے یہ عالم ہے کہ ہم ہندوؤں کو کبھی بھی امید نہیں ہوتی کہ ہم یہاں پر عزت کی زندگی گزار سکیں گے۔ اب تو ہم میں سے کچھ سکھ دھرم اختیار کرنے لگے

ہیں، سکھوں کی یہاں پھر قدر ہے، الباکستان سکھوں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کر کے خالصتان کی تحریک کو یہاں سے شہ دیتا رہتا ہے۔ کمار نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے سچ بولنے کی کوشش کی۔ ''لیکن ڈاکٹر صاحب، الباکستان کبھی بھی کشمیر یا بھارتی پنجاب پر قبضہ نہیں کر سکتا، یہ پہلے بنگال گنوا چکا ہے، اب بلوچستان بھی گنوا بیٹھے گا، کشمیر تو اس کے ہاتھ میں آنے سے رہا، ہمارے قائد تو جناح پور کی علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔'' ڈاکٹر رضوی بولا۔ ''بھائی، آپ کا دیش ہے، آپ جانیں۔ ہم تو نہ اس کے بنانے والوں میں تھے اور نہ توڑنے والوں میں ہوں گے'' ڈاکٹر کمار نے بات ختم کرنا چاہی۔ اتفاق کی بات ہے کہ جس روز امام رضوی ڈاکٹر ودیا کمار کے ساتھ بحث کر رہا تھا اُس کو اسی روز لندن قائد کے آفس سے فون آیا کہ اب جنرل اشرف کی حکومت کا ڈٹ کر ساتھ دینا ہے کیونکہ کچھ معاملات حالتِ مجبوری میں طے پا گئے ہیں۔ اب شاید جنرل اشرف نواز لیگ اور پیپلز پارٹی دونوں کو سبق سکھائیں گے۔ امام رضوی فون سننے کے بعد دیر تک سوچتا رہا کہ قائد اور پارٹی کا ہیڈ کوارٹر ہی بہتر جانتے ہوں گے کہ کس طرح سندھی نیشنلسٹوں اور پنجابی سیاستدانوں کو ڈیل کرنا تھا، اُسے تو یہ معمہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

*****

2008ء

بریگیڈیئر آصف راولپنڈی کی لال کوٹھی سے لال مسجد تک کی کارروائیوں پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ لال کوٹھی کے بلا شرکت و غیرے مالک شیخ راشد وزیر ثقافت اور انفارمیشن تھے جس کے بارے بریگیڈیئر آصف کو پکی انفارمیشن تھی کہ شیخ راشد اپنے جثے کے مطابق بھاری بھرکم اداکاراؤں کے ساتھ تعلقات استوار کرتے کرتے چلبلی اور پتلی اداکاراؤں اور ماڈلوں کی طرف راغب ہو رہا تھا۔ میڈیا اور ثقافتی اداروں کے معاملات پر اُس کی گرفت مضبوط اس ارادے کے ساتھ ہو رہی تھی کہ وہ فلم اور ٹی وی کی ایسی ایکٹرسوں کو اپنے شکنجے میں لانا چاہتا تھا جو پڑھے لکھے گھرانوں سے تعلق رکھنے کے ناطے

شیخ راشد کو پینڈو پروڈکشن سمجھ کر کسی خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ اب شیخ راشد اُن کو ایوارڈوں اور عہدوں کے جھانسے دے کر راتوں کو اپنی لال کوٹھی بلاتا تھا۔ شیخ راشد کے لال مسجد والوں سے بھی اچھے تعلقات تھے۔ لال مسجد والوں پر بریگیڈیئر آصف نے کرنل عارف کو مامور کر رکھا تھا۔ کرنل کی اطلاعات کے مطابق لال مسجد والے فوج کے افغان جہاد اور آزادی کشمیر کی تحریک کے سفر میں خود سے ہی آگے نکلتے جا رہے تھے۔ شیخ راشد کے کشمیری جہادی کیمپ کے حالیہ دورہ سے کرنل نے رپورٹ بھیجی تھی کہ شیخ صاحب لال مسجد والوں کو سمجھانے کی کوشش کریں گے کہ وہ افغان اور کشمیر محاذوں میں اُتنا ہی آگے بڑھیں جتنا اُن کو الباک آرمی کہے۔ بریگیڈیئر نے کرنل کو فون پر بتایا کہ شیخ راشد ایک سچا الباکستانی نمونہ ہے جو الباکستان کے جہاد میں بھی پیش پیش تھا اور ایک لبرل آدمی بھی تھا جو شراب و کباب و شباب کی محفلیں لال کوٹھی میں سجاتا رہتا تھا۔ بریگیڈیئر کو شیخ راشد کا ایک حالیہ بیان پسند آیا تھا جو انہوں نے ایک نوخیز ٹی وی اینکر کو اپنی غیر شادی شدہ زندگی کے حوالے سے دیا تھا، "بی بی جب دودھ بغیر بھینس پالے ملتا ہو تو بھینس رکھنے کی کیا ضرورت ہے"۔ شیخ راشد اور وہ نوخیز ٹی وی اینکر دونوں ہی شرما گئے تھے۔ بریگیڈیئر کو اس بیان کے تناظر میں اپنی پاکباز بیوی یاد آئی جس کو بھینس سے تشبیہ دینے پر اُسے ہنسی آ گئی۔ اُس نے سوچا کہ بیوی کو شیخ راشد کا یہ قول ضرور سنائے گا۔

*****

2008-2011ء

2008میں پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آ جانے کے بعد فوجی بلی اور سیاسی چوہوں کا نہ ختم ہونے والا کھیل شروع ہو چکا تھا۔ وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ الباکستان کا سب سے اہم آئینی عہدہ کہا جاتا تھا مگر اس کی اہمیت کا دارومدار بھی شخصیت پر ہوتا تھا۔ 1990 کی دہائیوں میں نواز شریف اور بے نظیر کے ادوار میں صدر کی کوئی حیثیت نہ

ہوتی تھی مگر یہ الگ بات تھی کہ اس زمانے کے صدور نے آرمی کی ہدایات پر وزراء اعظموں کی حکومتیں برطرف کر دی تھیں۔ 1999 سے 2008 تک صدر اشرف ہی سب کچھ تھے، وزیر اعظم تو اُن کے ٹھپے لگنے سے آتے اور جاتے تھے۔ 2008 کے انتخابات جیت لینے کے بعد پیپلز پارٹی کولیشن حکومت بنانے میں کامیاب ہوئی مگر صدر زرداری کلیدی حیثیت اختیار کر گئے، وزیراعظم گیلانی تو انگوٹھا چھاپ وزیراعظم بن کے رہ گئے تھے جن کے بیٹے کو اُن کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران ہی طالبان نے اغوا کر لیا تھا۔ کچھ مبصرین کے نزدیک آئی ایس آئی اس اغوا کے پیچھے تھی تاکہ وزیراعظم اُن کے کٹھ پتلی بنے رہیں مگر گیلانی صاحب صدرزرداری کے وفادار رہے۔ انہوں نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے آخری دن تک صدر زرداری کے اثاثوں کے راز چھپانے کی کوشش کی۔ صدر زرداری نے نئے آرمی چیف جنرل کیانی کے بھائیوں کے ساتھ اسلحے کا کاروبار بھی کیا، کچھ آئینی اصلاحات بھی کیں۔ لینڈ مافیا کے ساتھ اچھے کاروباری روابط رکھے، فوج کے کچھ جرنیلوں، بریگیڈئیروں اور کرنیلوں کو خوش بھی رکھا اور آئی ایس آئی کی روایتی سیاسی سازشوں کو بھی سہا۔ کپتان خان اور طاہر قادری کے دھرنے بھی سہے۔ وار آن ٹیرر کے رہے سہے نتائج بھی بھگتے۔ آئی ایس آئی کی سازشوں کو امریکہ میں اپنے سفیر حسین ربانی کی مدد سے کیری لوگر بل امریکی کانگریس سے پاس کروانے کے بعد کچلنے کی بھی کوشش کی۔ صدر زرداری کو جہاں اپنے دورِ حکومت میں جمہوریت کو بحال رکھنے کی داد ملی وہاں اُن پر کرپشن کے ریکارڈ الزامات کے نتیجہ میں غیر معمولی شہرت بھی ملی۔ اسی اثناء مئی 2011 میں امریکی آپریشن کے دوران اسامہ بن لادن کی ہلاکت ہوئی۔

*****

گیارھواں باب

اسامہ بن لادن کی ہلاکت الباکستان میں

2011ء

بریگیڈیئر آصف کو اس بات کا بہت قلق تھا کہ وہ میجر جنرل کے عہدے پر پہنچے بغیر ہی ریٹائرڈ ہو گئے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بریگیڈیئر ایبٹ آباد منتقل ہو گیا۔ اس دوران امریکیوں نے بریگیڈیئر آصف کو اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی تھی لیکن اس بات کی حقیقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ انہوں نے اس پیشکش کو قبول کیا بھی تھا یا نہیں۔ بریگیڈیئر آصف شیخ صاحب کی تلاش کے مشن کو بہت خفیہ رکھنا چاہتا تھا۔ بریگیڈیئر کی سرگرمیوں پر اُس کا سابقہ ادارہ بھی کڑی نظریں رکھے ہوئے تھا۔ بریگیڈیئر آصف کو کاکول اکیڈمی کے پاس ایک حویلی کے اندر جانے کا بہت خیال آتا تھا، اُسے اس حویلی میں شیخ لادن کی موجودگی کا خیال تو کبھی نہ آیا تھا مگر اُس حویلی کی پراسراریت مسلسل کھٹکتی تھی۔ دو مئی کے روز جب پوری دنیا کو اس حویلی کے اندر شیخ لادن کی ہلاکت کی اطلاع ملی تو بریگیڈیئر اب کڑی سے کڑی ملانے میں کامیاب ہو رہا تھا کہ اسے یہ حویلی کیوں پراسرار لگتی تھی۔ اگرچہ وہ اس حویلی کو آئی ایس آئی اور طالبان کی ملاقاتوں کی آماجگاہ سمجھتا تھا، اُس نے ایک دفعہ دو معروف طالبان لیڈروں کو حویلی کے اندر جاتے دیکھا تھا۔ یہ حویلی کاکول ملٹری اکیڈمی سے بمشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ بریگیڈیئر آصف

غیر معمولی اونچی دیواروں والی حویلی کو دیکھتے ہوئے ہر بار سوچتا اور کُڑتا تھا کہ آخر اُسے پتہ کیوں نہیں چلتا کہ اس کے اندر کون رہتا تھا۔ آئی ایس آئی اور ملٹری انٹیلی جنس والے اُسے یہی بتاتے تھے کہ یہ حویلی کسی قبائلی سردار کی تھی۔ بریگیڈیئر کا اپنا گھر اکیڈمی کے پاس تھا۔ اُسے اپنے آس پاس کے بیشتر بنگلوں کے مالکان کا پتہ تھا۔ آس پاس کے کئی بنگلے امیر خانوں اور سیاستدانوں کے تھے۔ اس علاقے میں فوجی افسروں کے تو بمشکل سات آٹھ بنگلے تھے، زیادہ تر یہ بنگلے سویلینز کے تھے۔ اپنی بڑی بڑی توندوں کے ساتھ گھومتے یہ تاجر نما سویلینز اُسے سخت ناپسند تھے۔ وہ اپنی فوجی زندگی کو یاد کرتا جو کتنی مشکل، سخت ٹریننگ سے آراستہ، نظم و ضبط کے عادی، صبح و شام کی ورزشوں سے لدی اور سیدھی لکیر کی فقیر تھی۔ اُسے اپنا ایک انکل یاد آیا جو میٹرک فیل تھا، کام چور اور نکمہ مگر ہیرا پھیری کر کے سیٹھ بن گیا۔ ایک بیٹا سیاست میں آیا اور اُس نے جی بھر کر کرپشن کیا، دوسرے بیٹے نے باپ اور بھائی کی مدد سے لینڈ مافیا بنا لیا۔ اب اُن کے ملک بھر میں موٹل تھے۔ سب کی توندیں نکلی ہوئی تھیں۔ آصف اُن کو یاد کرتے ہوئے بلڈی سویلینز کے بارے سوچنے لگا کہ اُن کو فوجیوں کی محنت ومشقت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ بلڈی سویلین ہم محنتی اور پُر خلوص فوجیوں پر حکمرانی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی کیا مجال کہ یہ کاکول اکیڈمی کے تربیت یافتہ فوجی افسروں پر حکمرانی کر سکیں۔ اُن کرپٹ اور بڑی توندوں والوں کو فوجیوں پر حکمرانی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ خان، یہ پنجابی سوداگر، میمن صنعت کار، سندھی وڈیرے، بلوچ سردار اور مہاجر چھوکرے ہم فوجیوں پر حکمرانی کا حق نہیں رکھتے۔ ہم فوجیوں کی دیانتداری کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو گا کہ مجھ جیسے سینئر آئی ایس آئی افسر کو بھی شیخ لادن کی اس علاقے میں موجودگی کا علم نہ تھا، شاید چیف صاحب کو بھی علم نہ ہو۔ فقط دو ایک افسروں کو ہی علم ہو گا۔ اب یہ بلیک میلر اور نالائق صحافی کاکول اکیڈمی اور فوج پر انگلی اٹھانے کے لئے ایبٹ آباد جوق در جوق آن پہنچے تھے۔ ریٹائرڈ بریگیڈیئر آصف کو شیخ لادن کی ہلاکت کی اطلاع پر بہت افسوس ہوا تھا۔ "شیخ لادن پاکستان کے لئے سونے کی چڑیا تھے۔" اُس نے فون پر ریٹائرڈ کرنل عارف سے اپنا دکھ سانجھا کیا۔ "دیکھو یار مجھے اُن سے ملنے کی کتنی تمنا تھی مگر نہ

مل سکا، مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ اور میں ایک دن ایک ہی محلے میں آبسیں گے۔ کاش نئے ڈی جی مجھ پر اعتماد کرتے تو میں شیخ لادن کی خود خدمت کرتا۔ آصف نے عارف سے کہا "آصف صاحب، میں تو یہ خبر سننے کے بعد سمجھا تھا کہ شاید آپ نے گھر ایبٹ آباد شیخ لادن صاحب کی قربت کے لئے بنایا تھا"، عارف نے جواباً کہا۔ "ارے یار، یہ تو اتفاق تھا، کاش مجھے اُن کی خدمت کے قابل سمجھا جاتا"۔ "سر شکر کریں، آپ شیخ لادن کے قریب نہیں پہنچے ورنہ امریکیوں نے آپ کو بھی نہیں چھوڑنا تھا"، کرنل نے کہا۔ "ان امریکیوں کی ایسی کی تیسی، رات کے اندھیرے میں حملہ کرنے آتے ہیں۔ دن کو تو آکر دکھائیں"۔ آصف نے جواب دیا "سرجی، اب کیا کرنا ہے؟" عارف نے پوچھا۔ "پاکستان آرمی پر سوال کرنے والے ہر غیر ملکی رپورٹر کو خاص طور پر بتانا ہے اور بار بار بتانا ہے کہ پاکستان کی دہشت گردی کی جنگ کے خلاف خود کتنی قربانیاں ہیں۔ ان کنفیوژ مغربی رپورٹروں کو بار بار بتائیں کہ ہم دہشت گردی کی یہ جنگ مغرب کی خاطر لڑ رہے تھے جس میں ہمارا بے تحاشہ نقصان ہوا ہے، مغربی صحافی یہ بات کافی حد تک مان لیتے ہیں۔ شیخ لادن کی حویلی میں رہائش کے بارے تو ہر بار یہی کہنا ہے کہ ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا۔ اس ضمن میں کچھ حرام خور پاکستانی صحافیوں اور اُن مقامی لوگوں کو ٹھکانے لگانا ہے جو منہ کھول کھول کے کہہ رہے ہیں کہ یہ ممکن نہیں کہ آئی ایس آئی کو شیخ لادن کی ایبٹ آباد میں موجودگی کا علم نہ ہو اور جو اس بات کی منادی کرتے بھی نہیں تھکتے کہ اس شہر میں تو چڑیا بھی فوج کی مرضی کے بغیر پر نہیں مار سکتی۔ ایسے حرامی صحافیوں اور مقامیوں کی گانڈ میں ڈنڈا دینا چاہئے۔" آصف غصے سے بولا۔ "سنا ہے کسی ڈاکٹر شکیل آفریدی نے شیخ کا سراغ سی آئی اے کو دیا تھا" عارف نے جاننا چاہا۔ "اُس کو تو نہیں چھوڑیں گے۔" بریگیڈیئر نے جواب دیا۔ عارف کے ساتھ اس ٹیلی فونک گفتگو کے بعد آصف نے اپنے ایک جونئیر حسن منظور کو فون کیا جو ترقی پا کر ایک کرنل کی حیثیت سے آئی ایس آئی میں کام کر رہا تھا۔ "حسن، میرے لائق کوئی کام بتاؤ، میں ادھر ایبٹ آباد میں ہی رہ رہا ہوں۔" "سر ابھی تو کچھ نہ کریں، میں آپ سے رابطے میں رہوں گا" حسن نے مختصراً جواب دینے کے بعد فون بند کر دیا۔ آصف نے شیخ لادن کی رہائش

گاہ کی طرف پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔ اپنی گلی سے دائیں طرف کی سڑک مڑتے ہی اُسے معلوم ہوا کہ رستہ بند تھا۔ پولیس اور فوجی گاڑیوں کے علاوہ دنیا بھر کے ٹی وی چینلوں کے موبائل یونٹ اُس سڑک کو بند کئے ہوئے تھے۔ پولیس کے ایک ٹرک پر تعینات ایک اہلکار نے اُسے آگے بڑھنے سے روکا۔ اُس نے اپنی شناخت کرائے بغیر پچھلے کھیتوں کی جانب سے شیخ لادن کے گھر کی جانب کا رستہ لیا۔ یہ علاقہ آج سے پہلے سنسان علاقہ تھا۔ کھیتوں کے اس طرف بچے کرکٹ، فٹ بال یا والی بال کھیلتے ہوئے کبھی کبھار نظر آتے تھے۔ پولیس اور فوج نے کھیتوں کی طرف سے بھی اسامہ کے گھر کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ اُسے دور سے کنکریٹ کی یہ عمارت کسی زخمی پرندے کی طرح دکھائی دی جس کے پر جیسے کسی نے کاٹ دیے تھے۔ وہ مزید آگے بڑھنے کی بجائے ایک کھیت کی منڈیر پر دھرے پتھر کے اوپر بیٹھ گیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ امریکیوں نے اتنا بھیانک آپریشن رات کے اندھیرے میں پاکستان کی حدود کے اندر آ کر کیا تھا۔ اس آپریشن کے گزرنے کے بارہ گھنٹے بعد وہ فوج اور پولیس کی گاڑیوں کے ایک بریگیڈ کی نقل وحرکت دیکھ رہا تھا، اُن کے ساتھ ساتھ ایبٹ آباد کے رہائشیوں کا ایک جمِ غفیر جیسے ایک تفریح کی غرض سے اس مکان کے تینوں اطراف کے کھیتوں میں جمع تھا۔ مقامی و غیر ملکی میڈیا کے ٹی وی کیمرے لوگوں کے ردعمل کو ریکارڈ کر رہے تھے۔ آصف کو حیرت تھی کہ آئی ایس آئی سمیت دوسرے ادارے کیسے ان کیمروں کو اس علاقے میں آنے کی اجازت دے رہے تھے۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ ان کیمروں کو جا کر توڑ دے مگر وہ اپنی بے بسی کو صاف محسوس کر رہا تھا۔ کوئی دو گھنٹے اس منظر کو ایک عام شخص بن کر دیکھتے رہنے کے بعد وہ اپنے گھر کو واپس چلتے ہوئے سوچنے لگا کہ اپنی پوزیشن سے ریٹائرڈ ہو جانے کے بعد آدمی کس قدر بے معنی ہو جاتا ہے۔ *****

پختون آواز اخبار کے ایبٹ آباد دفتر میں مقامی صحافی آج غیر ملکی صحافیوں کے ساتھ باتیں کرتے اور انہیں چائے پیش کرتے تھک سے گئے تھے۔ ایڈیٹر محمد جان نے الجزیرہ نیوز کے رپورٹر کو بتایا کہ ممکن تو نہیں کہ آئی ایس آئی کے کچھ خاص افسروں

کے علم کے بغیر اسامہ بن لادن اس گھر میں رہ رہا تھا۔ جب رپورٹر نے اسامہ بن لادن کی بیویوں کے بارے جاننا چاہا تو محمد جان کو شرمندگی سے ہو رہی تھی کہ کس طرح وضاحت کرے کہ شیخ کا کام جہاد اور سیکس کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا۔ الجزیرہ کے نائجرین کرسچئن صحافی ٹام مانکے نے شیخ کے جہاد اور سیکس کے حوالے سے چبھتا سوال کیا تو ایسوسی ایٹ پریس کے صحافی تھامس ڈائر نے محمد جان کی مشکل کو بھانپتے ہوئے صورتحال کو یہ کہہ کر سنبھالا کہ سیکس انسانوں کا مسئلہ ہے۔ ہمارے ویسٹرن کلچر میں سیکس کا عمل بغیر منافقت کے ہوتا ہے مگر ایسٹرن اور اسلامک کلچر میں منافقت کا عمل دخل رہتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ٹام مانکے تھامس ڈائر کو جواباً ہاتھوں ہاتھ لیتا ایڈیٹر محمد جان نے اپنے دل کی بات کر کے ماحول کے تناؤ کو صاف کر دیا۔ ایڈیٹر کہنے لگا، ”بھائیو ہم سے تو ایک عورت سنبھالی نہیں جاتی، یہ تو شیخ کی ہمت تھی جو ہر چند سالوں بعد کسی نئی عورت کو اپنے حرم میں لے آتا تھا“۔ ”عین اسلامی روایات کے مطابق“ ٹام مانکے نے طنزاً لقمہ دیا۔ ”بھائیو، یہ مسئلہ کسی مذہب کے ساتھ جڑا ہوا نہیں، یہ مسئلہ تو مردوں کے خصیوں میں بندھی خواہشات کے ساتھ جُڑا ہوا ہے“ تھامس ڈائر کے اس جملے نے ایڈیٹر کے کمرے کو شگفتگی سے بھر دیا۔ اطلاعات کے مطابق شیخ کی تین بیویاں اس حویلی میں تھیں جو زندہ بچ گئی تھیں، ان کو پاکستان آرمی نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا، یہ بھی ایک خبر تھی۔

☆☆☆☆☆

المعروف طالبان خان عرف کپتان خان کو جب شیخ اسامہ کی ہلاکت کی اطلاع جسٹس پارٹی کے وائس پریذیڈنٹ کے ایک ٹیکسٹ میسج کے ذریعے رات دو بجے ملی تو وہ صوبہ سندھ میں پارٹی کے ریسٹ ہاؤس میں ایک نوخیز کارکنہ کے ساتھ دوسری بار سیکس کر کے فارغ ہوا تھا۔ اسلامی جمہوریہ الباکستان میں بیوروکریسی، آرمی، میڈیا کھڑپینچوں، ٹیکنوکریسی اور سیاستدانوں کے لئے جنسی عیاشی کی فراہمی بھرپور انداز میں

رہتی تھی۔ طالبان خان نے نوخیز کارکنہ کو اونگھتا چھوڑ کر اپنی شلوار کرتا کو پہنا۔ جب سے وہ سیاست میں آیا تھا وہ مغربی لباس سے زیادہ اب یہی الباکستانی لباس پہنتا تھا جس میں وہ اپنے اعضائے رئیسہ کو کھلا کھلا محسوس کرتا تھا۔ اس نے کمرے سے باہر نکل کر پارٹی کے دو اہم لوگوں کو فون کئے۔ انہوں نے اسی وقت طالبان خان کے پاس آنے کے ارادے کا اظہار کیا۔ خان بھی اس حیرت ناک خبر کے سننے کے بعد لوگوں سے ملنے کا بیتاب تھا۔ اُس نے ان کو آنے کی اجازت دی۔ پھر اس نے آئی ایس آئی کے ایک اہم افسر اور ایک لیفٹیننٹ جنرل کو ٹیکسٹ میسج اس ارادے سے کئے کہ اس واقعہ کی تفصیلات کو مزید جان سکے۔ اسی خبر کی پریشانی میں اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ وہ سعد منیر اور عمر سعید کے آنے سے پہلے نہا لے کیونکہ اُس نے گزشتہ دو گھنٹوں کے دوران نوخیز کارکنہ کے ساتھ دوبار سیکس کیا تھا اور یہ بھی سوچا کہ نوخیز کارکنہ کو جگا کر ڈرائیور کو اُس کے گھر چھوڑ آنے کا کہے۔ ویسے تو اُس کی پارٹی کے ساتھی خان کی سیکس پارٹیوں کو دیکھنے اور اُن کا اہتمام کرنے کے عادی تھے۔ چند روز بعد خان کا ایک انٹرویو ایک برطانوی اخبار میں شائع ہوا جس میں اُس نے اُلٹا امریکہ کو اسامہ بن لادن کا قاتل قرار دیتے ہوئے اس واقعہ کو الباکستانیوں کے جذبات کو ضرب لگانے کے مترادف قرار دیا تھا۔ اس انٹرویو کے شائع ہونے پر چند آرمی جرنیلوں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ڈٹ کر امریکہ کی مذمت کی تھی۔

****

2011-2018ء

خان نے بعد میں آنے والے مہینوں کے دوران قبائلی علاقوں پر امریکی ڈرون حملوں کی آئی ایس آئی کی ہدایات کے مطابق بھرپور مخالفت کی چونکہ ان حملوں میں آئی ایس آئی کے پالے ہوئے سرکردہ طالبان لیڈر ہلاک ہوتے جا رہے تھے۔ خان کی امریکیوں کے خلاف مذمتی ریلیوں سے لے کر زرداری اور نواز شریف کی حکومتوں کے خلاف دھرنوں اور جلسے جلوسوں کا جہاں ایک بڑا مقصد آرمی کے ایجنڈے کو پورا

کرنا ہوتا تھا وہاں آرمی کی سرپرستی میں چلنے والے درجنوں ٹی وی چینلوں کے ذریعے اُس ریاستی عسکری بیانیے کو بھی باربار دہرانا ہوتا تھا کہ ملک کے سبھی سیاستدان ذلیل، کمینے اور بدعنوان ہیں، یا تو ملک کو فوج چلا سکتی ہے اور اگر کوئی سیاستدان ان آزمودہ سیاستدانوں کی فہرست سے باہر ہے تو وہ خان ہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ قوم میں اُس کی حیثیت ایک ہیرو کی تھی۔ وہ عوام میں کافی چاہا جاتا تھا۔ چندوں کی مدد سے چلنے والے مخیر کاموں نے بھی اُسے اچھی خاصی شہرت دی تھی۔ وہ دوسرے سیاستدانوں کی عمومی نااہلیت اور بدعنوانیوں کو ڈھال بناتے ہوئے خود کو ایک نعم البدل کے طور پر پیش کیا کرتا تھا۔ ان باتوں کے علاوہ دو مزید باتوں نے اُس کو عوام میں پذیرائی دے رکھی تھی۔ عوام اُس کی ماضی میں ایک درجن سے زائد رہنے والی گوری گرل فرینڈز کی وجہ سے بھی اُس کے بہت عاشق تھے چونکہ الباکستان کی پورنوگرافک فلموں اور تصویروں کی رسیا عوام اپنے لیڈر کو کسی پورنوگرافک فلم کے ہیرو کے طور پر دیکھتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری اہم بات اس کی مذہب کی جانب واپسی اور عوامی سطحی سوچ سے آگے نہ سوچ سکنا اُسے اُس کی پسندیدہ عوام کے ساتھ جوڑتا تھا۔ تاہم الباکستان میں کچھ ایسے طبقے بھی تھے جن کی سوچ خان اور اُن کے چاہنے والے سطحی لوگوں سے بہتر تھی جیسے قوم پرست سندھی، مہاجر، بلوچ اور پشتون جو خان کی دھاندلی زدہ ذہنیت سے خار کھانے لگے تھے۔ دھیرے دھیرے پنجاب کے لوگ بھی خان کی سوچ کو ناپسند کرنے لگے۔ بالآخر 2018 کے الیکشن میں الباک آرمی بہت محنت کر کے اُس کی پارٹی کو انتخابات جتوانے میں کامیاب ہوگئی اور وہ الباکستان کا سربراہ بن گیا۔ اُس نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے حلف کے موقع پر ہندوستان کے ایک جذباتی پنجابی کرکٹر کو تو مدعو کیا مگر اپنی بیٹی اور بیٹوں کو شرکت کی دعوت نہیں دی۔ تاریخ کی کتابوں میں یہ سب کچھ لکھا جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

بارھواں باب

انڈین ایمبیسی الباکستان میں 'را' کا دفتر

2018ء

اجے شرما کو اسلام آباد میں بھارتی سفارتخانے میں آئے چھ ماہ سے زائد عرصہ ہو چکا تھا۔ ویسے تو اُس کی تعیناتی سیکنڈ سیکرٹری کے طور پر تھی مگر اُس کا تعلق 'را' سے تھا۔ چھ ماہ کے دوران اُس کو بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ اُس کی حرکات و سکنات کافی محدود تھیں۔ وہ 'را' کے کام سے ہٹ کر صرف سیر کے لئے باہر جانا چاہتا تھا مگر اُس کے ایک ایک پل کی نگرانی کی جاتی تھی۔ الباکستان حکومت کی طرف سے بھارتی سفارتخانے کے تمام عملے کو ہدایات دی گئی تھی کہ دشمن ملک کے نمائندے ہونے کے ناطے وہ عوام، مذہبی گروہوں اور دہشت گردوں کی زد میں ہیں لہذا اُن کے حق میں بہتر یہی ہے کہ وہ خود سے اپنی نقل وحرکت کی پیشگی اطلاع دیں تاکہ اُن کو مناسب سیکیورٹی بھی دی جائے اور ٹھیک سے نگرانی میں بھی رکھا جائے۔ اجے شرما کو معلوم تھا کہ کچھ ایسی ہی صورتحال الباکستانی سفارتی عملے کی دہلی میں تھی۔ مگر اجے شرما کو اپنے سفارتی اور انٹیلی جنس کام سے ہٹ کر کئی کام تھے۔ وہ پنڈی کے چپے چپے میں پھرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے پتا کو وچن دیا تھا کہ وہ بھابھڑا بازار، راجا بازار، گنج منڈی، پرانا قلعہ اور کوہاٹی بازار کا حال اُس کو بتائے گا۔ نیز رام داس مندر اور لکشمی نارائن مندر کے ساتھ گردواروں کا احوال بھی اُسے لکھے گا۔ اُس کی ماتا تو پنڈی کی باتیں سناتے نہ

تھکتی تھیں۔ ایک دن وہ اسی تھکاوٹ میں بھگوان کو پیاری ہو گئیں۔ اُس کے پتا اُٹھتے بیٹھتے لال کوٹھی کا ذکر کرتے تھے جو پتا کے دوست کے انکل لالہ سیگل کی تھی جن کی داشتہ بدھامائی کا چرچا بھی گھر میں ہوتا رہتا تھا۔ اُس لال کوٹھی کے اندر مندر لالہ سیگل کے لئے تھا اور مسجد بدھا مائی کے لئے تھی۔ اجے شرما اُس لال کوٹھی کو دیکھنا چاہتا تھا جس کے بارے اُسے بھارت میں بھی علم تھا کہ اُس پر آئی ایس آئی کے چہیتے شیخ راشد کا قبضہ تھا۔ اجے شرما تو بس اُسے دیکھنا چاہتا تھا اور اُس کوٹھی کے ساتھ اُن تمام گلیوں، بازاروں، مندروں، گوردواروں اور چوباروں کو جن کے بارے اُس نے سن رکھا تھا کہ تقسیم سے پہلے ان علاقوں میں اکثریت ہندوؤں اور سکھوں کی تھی۔ اجے کے باپ دادا پنڈی سے تعلق رکھتے تھے، اس سبب سے اُس کے بہت سارے رشتہ داراور ملنے والے بھی پنڈی وال تھے۔ 'پنڈی وال' کا لفظ اُس کے بزرگ بہت استعمال کرتے تھے۔ وہ خود تو دلی میں پیدا ہوا تھا۔ مگر پنڈی بچپن سے ماتا پتا نے اُس کے اندر بو دیا تھا۔ اب وہ پنڈی کے ساتھ والے نئے شہر میں رہ رہا تھا مگر اُسے اسلام آباد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ پنڈی گھومنا چاہتا تھا اور پھر اگر موقع ملے تو لاہور، قصور، ملتان، سرگودھا اور ہو سکے تو پورے پنجاب کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن ایک ٹریول ایجنسی کا مالک اُس سے ملنے آیا جو اصل میں 'را' کا ایک مخبر تھا۔ اُس کی ٹریول ایجنسی عین راجا بازار کے بیچ میں تھی۔ وہ اُس سے انٹیلی جنس کی معلومات جمع کرنے سے زیادہ پنڈی کا حال چال جانتا رہا۔ آئی ایس آئی کی کڑی نگرانی کی وجہ سے اُس کے پاس زیادہ مخبر نہیں آتے تھے۔ جو چند ایک آتے تھے اُن کے بارے وہ بہت احتیاط کرتے تھے کہ وہ کہیں ڈبل ایجنٹ ہی نہ ہوں۔ وہ اُس ٹریول ایجنٹ سے راجا بازار اور لال حویلی کی باتیں کرتے کرتے اُن پاکستانیوں کے پاسپورٹ چیک کرنے لگا جو درگاہ نظام الدین پر جانا چاہتے تھے۔ اُس کا جی تو چاہتا تھا کہ ان سب کے ویزے لگا دے، بھلا بھارت کو ان سے کیا خطرہ ہو گا۔ یہ لوگ گھوم پھر کو اپنے ہمسایہ شہروں کو جی بھر کر دیکھ لیں مگر پالیسیوں کے تحت اُسے ان پاسپورٹوں کی تفصیلات بھارت بھیجنا تھیں۔ 'سر جی، ان میں سے کچھ لوگ بہت کام کے ہیں، یہ آپ کو یہاں ملنے تو نہیں آ سکتے کیونکہ

آئی ایس آئی ان کو باہر دبوچ لے گی مگر ان کو ویزے دیں، یہ لوگ وہاں پر آپ کے لوگوں کو کھل کر بتائیں گے' ٹریول ایجنٹ نے فخریہ انداز میں جیسے بڑے کام کی بات بتائی ہو۔ 'یہ لوگ وہاں پر ہمیں کیا راز بتائیں گے، کیا ان میں سے کوئی فوجی راز جانتا ہے یا کشمیری کیمپوں کے ثبوت دے سکتا ہے؟' اجے نے بڑی مشکل سے اپنے کام کی طرف توجہ دینا چاہی۔ 'ہاں جی، آپ ان لوگوں کو آزما کر تو دیکھیں' ٹریول ایجنٹ نے زور دیتے ہوئے کہا۔ 'آپ باہر نکلیں گے تو آئی ایس آئی آپ کو کیا دبوچے گی نہیں؟' اجے نے ٹریول ایجنٹ کا حال جاننے کی خاطر پوچھا۔ 'ہاں جی، آئی ایس آئی مجھے ہر بار پکڑتی ہے مگر جب میں اُن کو بتاتا ہوں کہ اجمیر شریف اور دہلی وفد لے کر جا رہا ہوں تو چھوڑ دیتی ہے'۔ ٹریول ایجنٹ نے وضاحت کی۔ 'ہوں، ٹھیک ہے میں ان پاسپورٹوں کی تفصیلات دلی بھیج دیتا ہوں، اگلے ہفتے تک پتہ چل جائے گا کہ کن کن کے ویزوں کا کلیرنس ملتا ہے' اجے نے میٹنگ برخاست کرنا چاہی۔ 'تھینک یو، سر جی، کوشش کریں کہ سب کو ویزہ مل جائے' ٹریول ایجنٹ اٹھتے ہوئے بولا۔ وہ کمرے سے نکل رہا تھا تو اجے نے سوچا کہ یہ ٹریول ایجنٹ بھی آئی ایس آئی کا مخبر ہو سکتا ہے۔

اجے شرما نے سفیر لکشمن رام چندرن کے ساتھ لنچ کرتے ہوئے جاننا چاہا کہ وہ کس طرح ایک ٹورسٹ کی طرح پنڈی کی گلیاں کوچے گھوم سکتا تھا۔ سفیر جس کا تعلق چنئی سے تھا، وہ ایک پنجابی ڈپلومیٹ کی پنڈی گھومنے کی تڑپ کو سمجھ نہ سکا۔ سفیر صاحب نے اجے سے انگریزی میں پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ ہمارے پنجابی ہندوؤں اور سکھوں کو ادھر کے پنجاب کی اتنی تڑپ کیوں ہے؟ 'سر آپ پنجابی تو دور کی بات ہے ہندی بھی نہیں بول سکتے، آپ کو کیسے بتاؤں کہ یہ اس طرف کا پنجاب ہمارا کٹا ہوا پنجاب ہے۔ ہمارے باپوں اور ماؤں کی دھڑکنیں ادھر ہی رُکی ہوئی ہیں'۔ اجے بولا۔ 'مگر یار، اب ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ یہ ایک الگ ملک بن چکا ہے جو کبھی بھی ہمارا حصہ نہیں بنے گا۔' سفیر نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ اجے کی بے بسی پر لطف اندوز ہو رہا ہو۔ 'سر، آپ کبھی پنڈی گئے ہیں؟' اجے نے اصل موضوع کی طرف واپس آنا چاہا۔ "کئی بار اسلام آباد پنڈی مین سڑکوں سے گزرا ہوں، راجا بازار کے آس پاس علاقوں میں

دو ایک بار جانا ہوا مگر بھارتی سفیر ہونے کے ناطے اسی بات میں بہتری ہے کہ گلیوں بازاروں میں نہ پھروں چاہے الباکستانی اسکیورٹی میرے ساتھ کیوں نہ ہو۔" سفیر نے مزید وضاحت کی۔ "تمہاری پنڈی کی سیر کے لئے الباکستان کے فارن آفس سے بندوبست کرنے کی درخواست بھیجتا ہوں" سفیر نے اجے کو بولنے سے پہلے ہی کام کی بات کی۔ 'سر، ایسا ممکن ہے؟' اجے نے حیرت سے پوچھا۔ "میں فوراً آفس لکھ کر دیکھتا ہوں کہ کیا جواب آتا ہے"۔ سفیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ایک ہفتے کے اندر اندر ہی فورن آفس سے جواب آیا کہ اُن کا ایک افسر اجے سے ملنے سفارت خانے آئے گا اور اجے کا پلان جاننا چاہے گا۔ اس جواب کے قریب ایک ہفتہ بعد عادل خان نامی ایک افسر اجے سے ملنے آیا۔ 'صاحب، آپ پنڈی کے بازاروں کی کیوں سیر کرنا چاہتے ہیں؟' عادل خان کا پہلا سوال ہی یہی تھا۔ 'میری ماں اور باپو دونوں پنڈی سے تھے، ماں تو پنڈی کی باتیں کرتے کرتے مر گئی، باپو کی آنکھیں تو آج بھی پنڈی کو یاد کر کے تر ہو جاتی ہیں۔ میں نے ساری زندگی اپنے گھر میں پنڈی کی اتنی باتیں سنی ہیں کہ میں بچپن سے ان گلیوں محلوں میں بس رہا ہوں مگر اُن کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے قدموں کے راہیں دل میں محسوس کرنا چاہتا ہوں، عادل صاحب آپ کو کیا بتائیں کہ پنڈی ہمارے لئے کیا شے ہے؟' اجے تھوڑا جذباتی ہو گیا۔ 'صاحب، آپ کو دکھا دیں گے، نو پرابلم۔ بلکہ اپنے پتا کو کبھی بلائیے اُن کو بھی دکھا دیں گے، اس سے پہلے کہ وہ اس دنیا سے گزر جائیں، پنڈی تو اب یہیں رہے گا'۔ عادل کے لہجے کی ترشی کو اجے نے صاف محسوس کیا۔ 'مسٹر شرما آپ کب جانا چاہیں گے؟' عادل نے پوچھا۔ 'کیا اگلے اتوار کو ممکن ہے؟' اجے نے عادل کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔ 'آپ کے دفتر کو کل تک کنفرمیشن مل جائے گی' عادل یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اگلے روز کنفرمیشن آ گئی کہ اتوار کو صبح گیارہ بجے عادل خان اپنے آفس ڈرائیور کے ساتھ اجے شرما کو اُس کے گھر سے پک کر لے گا۔

اتوار کو اجے شرما دس بجے تیار تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ ٹور اچھا رہا تو وہ باپو کو بھی الباکستان بلائے گا اور جب اُس کے بیوی بچے آئیں گے تو اُن کی سیر کے لئے بھی درخواست دے گا۔ ٹھیک گیارہ بجے وہ عادل خان کے ساتھ فارن آفس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اگلی سیٹوں پر ڈرائیور کے ساتھ ایک مسلح گارڈ موجود تھا۔ رستے میں عادل خان نے اجے کو پلان سمجھاتے ہوئے بتایا کہ مسلح گارڈ اپنی کلاشنکوف گاڑی میں چھوڑ دے گا مگر چھوٹے پستول کو لئے ہمارے پیچھے پیچھے یوں چلے گا کہ راہ گیروں کو گمان نہ ہو کہ یہ ہمارے ساتھ ہے۔ ''ہم دونوں بھی عام لوگوں کی طرح گھومیں گے'' عادل نے 'عام لوگوں' پر زور دیا۔ 'صاحب، آپ ہندی کے لفظ کم بولئے گا، لوگ انڈیا کے بارے اچھی رائے نہیں رکھتے۔' عادل نے مزید ہدایت دی۔ اجے نے عادل کی اس بات کے جواب پر سر ہلایا۔ بھیڑ بھرے بازاروں کے اندر جب گاڑی پہنچی تو اجے نے اس شہر کا موازنہ سب سے پہلے پرانے دلی سے کرنا چاہا مگر اُسے یہ پرانے دلی کے قریب نہ لگا۔ پرانا دلی تو چھوٹی چھوٹی گلیوں اور بازاروں کا ایک وسیع جنگل ہے، اُس نے سوچا۔ پھر اُس کا دھیان امرتسر، کانپور، لکھنو اور پٹھان کوٹ کے بازاروں کی طرف گیا مگر اُسے اُن کے ساتھ پنڈی کی مماثلت محسوس نہ ہوئی۔ اچانک جے پور کے ایک دو بازاروں کے گلابی رنگ کو چھوڑ کر اُسے ان کا مہاندرا پنڈی کے ان بازاروں جیسا لگا۔ ایک جگہ گاڑی رُکی تو عادل خان نے اجے کو باہر نکلنے کی دعوت دی۔ اجے گاڑی سے باہر نکلتے ہی عادل کے پیچھے چلنے لگا۔ اُس کے پیچھے عادل کا سپاہی یوں چل رہا تھا جیسے وہ اُن دونوں کو جانتا ہی نہ ہو۔ اجے کی جب سے سفارتخانے میں تعیناتی ہوئی تھی اُس کا پہلا موقع تھا کہ وہ الباکستان کے کسی بھیڑ بھرے بازار میں نکلا تھا۔ اُس نے لوگوں کے چہروں، چال ڈھال، آپس میں بول چال کے انداز، تھڑوں پر سجی دکانوں، گاہکوں اور دکانداروں کی پھرتیوں، مکانوں اور عمارتوں کے آرکیٹیکٹ کو ایک ساتھ جانچنا شروع کیا۔ اُسے پہلی نظر میں یہاں کے لوگوں کا جُثہ دلی کے عام آدمی کی نسبت بہت مختلف لگا۔ اُسے پھر باپو یاد آئے۔ اُن کا ڈھیل ڈھول بھی پنجابی پٹھانوں جیسا تھا۔ باپو کہا کرتے تھے اُن کے پنڈی کے لوگ پنجابیت اور پٹھانیت کا مکس ہوتے ہیں۔ اُسے باپو کی بات من و عن درست

لگی۔ ایک بار پھر اُسے یہاں کے لوگوں کا جُثہ راجستھانیوں اور پنجابیوں کے قریب لگا۔ مکانوں اور عمارتوں کے باہر سے نظر آنے والے چھجے دیکھ کر اُسے الہ آباد کی گلیوں کی عمارتیں یاد آئیں جو روایتی ہندو آرکیٹیکٹ کے حوالے کے طور پر اُس کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ اپنے شہر دلی کے بارے اُس کا یہی تاثر تھا کہ یہ شہر نا تو ہندوؤں کا رہا اور نہ ہی مسلمانوں کا۔ اس کے گلی کوچے بازار اس قدر سکڑ چکے تھے کہ وہ تو اب کسی بھی تہذیب کی ترجمانی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ درجنوں نئے تہذیبی ملغوبوں کے تانے بانے بُن رہے تھے۔ پرانی دلی بے ڈھنگی گلیوں، تاریک بازاروں اور لٹکتی تاروں والے ایسے محلوں پر مشتمل شہر میں ڈھل چکی تھی جہاں پراٹھے والی گلی، کناری بازار کے گوٹے اور کڑھائی والا کام، گورو گُریتج گردوارہ، شاہی مسجد اور کریم کی کبابوں والی گلی، دریا گنج کے کتب خانے اور لال قلعہ کے چاروں طرف لوگوں کا جمِ غفیر تو بڑھتا چلا جا رہا تھا مگر تہذیب کی ترتیب اور چاشنی دن بدن کم سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اُسے نئی دلی یاد آئی جو البتہ دلی کی تہذیب کی ترجمان کہلائی جا سکتی تھی۔ یہ نئی دلی کناٹ پلیس کے گرداگرد کے عالی شان روایتی ہوٹلوں، انڈیا گیٹ، پارلیمنٹ اور سرکاری عمارتوں کا ایک جنگل تھی۔ نئی دلی کے بعد کی دلی، گریٹر کیلاش، ساکیت اور پھیلتی دلی کے جنوب شمال، مشرق مغرب کے علاقوں کا آرکیٹیکٹ تو کمرشل عمارتوں، نئے مالوں، تین چار منزلہ فلیٹوں پر مشتمل گھروں کا بنا ہوا تھا۔ اُن کے آرکیٹیکٹ سے ہندو، مسلم یا سکھ کلچر سے وابستہ کوئی یاد اُسے نہ آئی۔ 'وہ تو بس اینٹوں کے ڈبے ہیں جن میں لوگ رہتے، بکتے اور مرتے ہیں۔' لگتا تھا کہ پنڈی کے بازاروں کا نقشہ اُسے ادھر ادھر کی بے سروپا سوچوں سے جوڑ رہا تھا۔ پھر اُس کے ذہن میں لال کوٹھی آئی۔ اچانک لال داڑھی والا ایک شخص اُس کے سامنے آیا۔ جس کی گردن پر کشمیری رومال دھرا ہوا تھا۔ عطر میں لپٹا وہ شخص اُس کے سامنے یوں گزرا کہ اُس کے عطر کی تیز خوشبو سے اجے کو ایک تیز چھینک آئی۔ 'واپس چلیں گے یا ابھی تھوڑا اور آگے جائیں گے''۔ عادل نے پوچھا۔ ''کچھ مندر گردوارے دکھا دیں اور ہو سکے تو لال کوٹھی بھی'' اجے نے التجائیہ لہجے میں جیسے درخواست سی کی۔ ''او، ہاں، میں بھول گیا تھا'' اجے نے یہ کہتے ہوئے اپنی جیب سے

ایک پرچی نکالی جس پر دو تین پتے لکھے ہوئے تھے۔ بھیڑ بھرے بازار سے ہوتے ہوئے وہ ایک نسبتاً کم بھیڑ والے کھلے چوراہے میں پہنچ گئے۔ اجے کے ذہن میں امرپورہ، انگت پورہ، اکال گڑھ، کرشن پورہ، موہن پورہ اور کرتار پورہ جیسے محلوں کے نام گونج رہے تھے جو اُس نے اپنے ممی ڈیڈی سے سُن رکھے تھے۔ کوہائی بازار کے مندر کے بارے اُسے اُس کے سفارتخانے نے بتایا تھا کہ اب وہ اسکول کی عمارت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ گوردوارہ باغ سرداراں پنجاب پولیس کے دفتر کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ گوردوارہ نرنکاری اسلامیہ شملہ اسکول میں ڈھل چکا تھا۔ کئی مندر گردواروں کی جگہیں تجارتی پلازوں اور رہائشی عمارتوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اجے کو راہ چلتے کئی پلازوں اور بلڈنگوں کے نیچے گردواروں اور مندروں کے ڈھانچے دکھائی دیئے۔ وہ موہن مندر کی جگہ دیکھنا چاہتا تھا جسے اپنے وقت کے مشہور ہندو حکیموں نے بسایا تھا۔ انہی سوچوں اور لوگوں کی بھیڑ سے بچتے بچاتے وہ کرشنا مندر تک پہنچ گئے۔ وہ اپنی تحقیق کر کے آیا تھا کہ تقسیم سے پہلے اس شہر میں تین سو سے زائد مندر ہوا کرتے ہیں۔ اب جیتا جاگتا ایک کرشنا مندر ہی رہ گیا تھا۔ مندر میں گھسنے سے پہلے عادل خان نے اُسے کہا کہ وہ پروہت کو ہرگز نہ بتائے کہ وہ انڈین ایمبسی میں کام کرتا ہے، صرف اتنا ہی کہے کہ وہ ایک ہندوستانی یاتری ہے۔ ایک سہمی شکل کا پروہت دروازے پر ملا۔ وہ اجے کے ساتھ عادل کو اور اُس سے پیچھے سیکیورٹی گارڈ کو آتے دیکھ کر سمجھ گیا کہ یہ لوگ خفیہ پولیس والے ہیں۔ اجے کو پاکستانی ہندوؤں کی مشکلات کا اندازہ تھا، اُس کی جانکاری کے مطابق پاکستانی ہندو بھارتی سفارتخانے سے ویزہ لینے کے علاوہ کسی قسم کا ناطہ رکھنے سے گریز کرتے تھے، پاکستان سے ہر سال ہزاروں ہندو بھارت جاتے اور اُن کی اکثریت وہی کی ہو رہتی۔ اُسے یاد آیا کہ دلی میں اُسے ایک بار پاکستانی ہندو نے بتایا تھا، "صاحب، آپ کو اندازہ نہیں کہ پاکستان میں ہمارے ساتھ کتنا برا سلوک ہوتا ہے، ہماری عبادت گاہوں پر لوگوں کے قبضے ہیں، اسلامی انتہا پسندوں نے ہماری زندگیاں اجیرن کر رکھی ہیں، معاشرے میں ہمیں کم تر سمجھا جاتا ہے، ہماری بچیوں کو زبردستی مسلمان بنا کر اُن کے ساتھ جنسی زیادتیاں ہوتی ہیں اور جب ہم اتنی مصیبتیں جھیلنے کے بعد ہندوستان

پہنچتے ہیں تو یہاں پر دلی سے گجرات تک، اُتر پردیش سے کیرالہ تک مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو ہندوستان میں برابری کے حقوق کے ساتھ رہتا دیکھتے ہیں تو ہمارا خون کھول اُٹھتا ہے"، اجے نے اُس کا آخری جملہ سن کر اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا، "کبھی مذہب کی بنیاد پر کسی کے خلاف دل میں بات نہ لاؤ"۔ "صاحب، آپ جو مرضی کہو، مگر میں تو اپنے دل کی بات کہے دیتا ہوں، اسی لئے ہمیں بجرنگی اچھے لگتے ہیں جو ہمارے دل کے جذبات سمجھتے ہیں، آپ جیسے بابو لوگ اس پھیلنگ کو کیا سمجھیں"، جواب میں پاکستانی ہندو بولا جو اب پاکستان واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اُس پاکستانی ہندو کی بات نے اجے کو اپنے پتا کی بات یاد دلا دی تھی۔ "اجے پنڈی لاہور جو ہمارے شہر تھے جہاں آدھے سے زیادہ ہندوؤں سکھوں کو مار دیا گیا، ہماری جائیدادوں پر قبضہ کر لیا گیا، ہم میں سے کچھ بڑی مشکل سے جان بچا کر دلی پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دلی میں مسلمانوں کے محلوں کے محلے آباد تھے۔ ہمارا اُن کو یوں آزاد رہتے دیکھ کر خون کھولتا تھا۔ مگر ہندو ان کے مقابلے میں بہت کم خونی ہوتے ہیں۔" کرشنا مندر کے باہر کھڑا ہندو پروہت کے ساتھ علیک سلیک کرتا پتا کی بات اُس کے اندر گونجنے لگی۔ کرشنا مندر کے اندر گھسے بغیر وہ عادل خان اور اُس کے سپاہی کے ساتھ آگے بڑھا تو تھوڑا چلنے کے بعد عادل خان نے ایک عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اجے کو بتایا کہ وہ لال کوٹھی ہے۔ لال کوٹھی کو باہر سے دیکھتے ہوئے اجے کے ذہن میں ممی ڈیڈی سے سُنی کئی کہانیاں اُس کوٹھی کے حوالے سے گھومنے لگیں۔ وہ اُس عمارت کے سامنے مبہوت سا کھڑا تھا۔ "اگر آپ ہمارے لئے کام کریں تو ہم آپ کو اس عمارت کے اندر کی بھی سیر کرواسکتے ہیں اور اس کے مالک شیخ راشد سے بھی ملاسکتے ہیں جو کئی ایک کشمیری کیمپوں کو چلاتے ہیں"، عادل خان کی آئی ایس آئی کی جانب سے اُن کے ساتھ کام کرنے کی اچانک آفر نے اجے کی جذباتی حالت پر بندھ باندھا۔ عادل کا یہ جملہ اُسے انتہائی غیر مہذب اور سفارتی آداب سے عاری لگا مگر اُس نے اُس کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے گوردوارہ بھائی مانی سنگھ کا پتہ پوچھا۔ "اس پتہ پر تو اسکول ہے، ہو سکتا ہے یہ پہلے گوردواہ رہا ہو۔ البتہ پنڈی سے باہر مشہور پنجہ صاحب گوردوارہ ہے" عادل خان نے اپنی معلومات پیش کیں۔ واپسی پر

اجے سڑکوں پر نگاہ دوڑاتے ہوئے سوچنے لگا کہ پنڈی شہر کی تھوڑی سیر کرنے سے اُسے ذاتی سطح پر احساس ہوا تھا کہ ہند کی تقسیم کس قدر غیر فطری ہوئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اپنے پتا کی بات ماننے پر قائل ہو گیا جو کہا کرتے تھے۔ "پاکستان کا چپہ چپہ ہندوستان کا اٹوٹ انگ تھا جسے انگریز نے عجلت اور سازش کے ساتھ توڑا اور ہند کو اُس کی آزادی کی سزا دی گئی۔"

*****

تیرہواں باب

ایک رائٹر کپتان خان کے دورِ حکومت میں

"نقاش احمد نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے گلی کی دائیں جانب بوسیدہ گھروں کی دیواروں پر چپکی چپچپاتی سبز کائی کے جالے کے اندر رینگتے پانی کی لکیر پر نظر دوڑائی۔ رات کی سیاہی میں پانی کے رینگنے کی آواز سانپ کی سرسراہٹ جیسی تو سنائی دے رہی تھی مگر باقی منظر دھندلایا ہوا تھا۔ اُس نے راکھ جھاڑنے کے بعد باقی بچے سگریٹ کو تیز کش لے کر ختم کرنا چاہا۔ اِس سے پہلے کہ اُس کا دھیان اپنے اِرد گرد کی اشیاء کی تفصیلات کو کریدنے کی طرف جاتا اُسے اُس شام حلقہ اربابِ ذوق میں پڑھی گئی غزل کے مصرعے یاد آنے لگے۔ خود غزل گو شاعر ہونے کی وجہ سے اُسے ساتھی شاعر ایوب خاور کی غزل کے مصرعوں کو من و عن دُہرانے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ اُسے احساس ہوا کہ بہت دنوں بعد اپنی غزل کے علاوہ کسی اور کا کلام اُس کی زبان پر چڑھا تھا۔ 'سات سُروں کا بہتا دریا، تیرے نام... ہر سُر میں ہے رنگ دھنک کا، تیرے نام'... ظالم نے موسیقیت سے لبریز کیسی غزل کہی ہے جس کے مصروں میں سُر اور لفظوں میں دھنک ہے جس پر سر دھننے کو جی چاہتا تھا۔ اُس نے ساتھی شاعر کی اس غزل پر اپنے اندر داد کے جذبے کو اُبھرتے محسوس کیا۔ نقاش احمد کا وہ دوست شاعر جو پاکستان ٹی وی لاہور کا پروڈیوسر بھی ہوا کرتا تھا اور اُسے بارہا ٹی وی اسٹیشن بلا چکا تھا۔ اُسی ٹی وی اسٹیشن کی عمارت کے اوپر نصب اونچے اینٹینا کی جلتی بجھتی سُرخ بتیاں اُسے اس رات کے اندھیرے میں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ اُس ٹی وی اسٹیشن کی عمارت

اِن بوسیدہ گھروں پر مشتمل محلوں سے زیادہ دور نہ تھی۔ اور وہ اُس عمارت کے پاس سے گزرتا ہوا بھی اپنے گھر تک پہنچ سکتا تھا مگر وہ جلیل کی کتاب لوٹانے کی خاطر راہ میں پڑنے والے اس محلے کی طرف نکل آیا تھا۔ یہ محلہ بھی پورے علاقے میں اپنی نوعیت کا انوکھا محلہ تھا جو ایک بڑے احاطے کی صورت آباد تھا۔ احاطے کے درمیان میں ایک وسیع میدان تھا جس کے گرد حال ہی میں لوہے کے جنگلے کا حصار بنایا گیا تھا جس کے بارے بچے بچے کی زبان پر تھا کہ معزول وزیراعظم کے تینوں ادوار کے دوران اُس نے پورے شہر میں اپنی فیکٹریوں سے لوہے کے جنگلے بنوا کر لگا دیئے تھے۔ جنگلے کے اندر میدان میں ایک طرف بچوں کے پارک کی جگہ دو تین جھولے لگا کر مختص کر دی گئی تھی۔ علاقے کے لوگوں کا خیال تھا کہ اُس کو باقاعدہ پارک کی صورت میں اگلے الیکشن کے قریب کے دنوں میں ڈھالا جائے گا۔ اُسے اُن جھولوں کو دیکھتے ہوئے گزشتہ الیکشن کے دن یاد آئے جس میں اُس کا پرانا ہمسایہ میاں اعجاز ایم پی منتخب ہوا تھا۔ وہ بے ترتیب باتوں کے اوپر تلے یاد آتے چلے جانے سے اکتا کر ایک اور سگریٹ جلانے کے لئے رُکا۔ اس نئے سگریٹ کے پہلے کش کے دھوئیں کو اندر کھینچتے ہوئے اس نے اس اندھیری رات میں جلیل کے گھر کو جنگلے کی دوسری جانب ڈھونڈنا چاہا۔ تاریکی کی قطار میں ایک ساتھ جُڑے ان پرانے گھروں میں سے جلیل کا گھر ڈھونڈنا دشوار لگ رہا تھا۔ اس نے دو اڑھائی فٹ اونچے کھڑے اس جنگلے کے اوپر ایک جست لگائی۔ کتاب اس کی بغل سے نکل کر جھولوں کے آس پاس کی ریتلی زمین پر گر پڑی۔ اس کے دائیں سینڈل کی نوک ایک اینٹ کے ساتھ رگڑی تو اس نے اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کی خاطر جھولے کا سہارا لینا چاہا۔ جھولا اُس کے جھولتے ہاتھ کو کھینچتا ہوا اس کے جسم کو مزید آگے گھسیٹتا چلا گیا۔ بالآخر اُس کے قدم توازن کی حالت میں آئے تو اس نے خود کو جھولے پر پیٹ کی طرف سے جھولتا پایا۔ اُسے جب یہ احساس ہوا کہ وہ کسی چوٹ کا شکار ہوئے بغیر حالتِ توازن میں آ چکا تھا تو اس کی ہنسی چھوٹ پڑی۔ 'بچت ہوگئی'، وہ اسی بوکھلائی سی ہنسی میں خود سے بولا۔ مکمل توازن کی صورت پکڑنے سے پہلے اسے تین چار بار مزید جھولنا پڑا۔ اس کا سگریٹ کسی مدھم انگارے کی صورت کتاب کے قریب

سلگتا نظر آیا۔ اس نے پہلے کتاب اٹھائی اور پھر سلگتے سگریٹ کے اوپر سے مٹی اور ریت کو جھاڑتے تین چار کش اوپر تلے کھینچے اور پھر سے اندھیرے مکانوں کی تاریکی کو جھاڑنے لگا۔ اُسے خیال آیا کہ اس احاطے کے گرداگرد کے اُن مکانوں میں سے کہیں کوئی اس کو گرتا دیکھ تو نہیں رہا تھا۔ 'کوئی نہ کوئی تو جاگ رہا ہو گا اور شاید کوئی باہر بھی جھانک رہا ہو' یہ سوچتے ہوئے نہ جانے کیوں اسے بیس پچیس برسوں پہلے کا یہ محلہ یاد آیا۔ یہ مکان تب بھی ایسے تھے مگر بیچ کا میدان اور اس کے گردا گرد جنگلہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ اُسے اس خالی میدان والی جگہ کی کئی شکلیں یاد آئیں۔ ایک وقت یہ جگہ سالوں تک جوہڑ کی صورت پڑی رہی جہاں ہر موسم کی بارشوں کا پانی ٹھہر جایا کرتا تھا۔ پھر یہ جگہ کارپوریشن کی طرف سے پانی کی رسائی کے نئے نظام کے زمانے میں کم و بیش پانچ برس خندقوں اور ٹیلوں کی صورت میں پڑی رہی۔ اُن دنوں یوں لگتا تھا کہ کارپوریشن کے ٹھیکیدار اس احاطے کو کھودنے کے بعد بھول گئے تھے۔ ٹھیکیداروں نے خندقوں سے نکلنے والی مٹی کو ٹیلوں کی صورت چھوڑ دیا تھا۔ بچوں کو یہ ٹیلے بہت بھاتے تھے۔ وہ گرمیوں کی شاموں میں خصوصاً ان ٹیلوں کو مری کی پہاڑیوں کے متبادل استعمال کیا کرتے تھے۔ اُسے یاد آیا کہ محلے کے ایک معزز حاجی چھلے نے کارپوریشن کے ادھورے کام کی خوب بدنامی کی جس کے نتیجہ میں وہ خود ایک علاقائی سیاستدان بن گیا تھا۔ نقاش احمد اِدھر اُدھر کی باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتے اور سگریٹ کا آخری کش کھینچتے جلیل کے گھر کی سمت پھر سے چلنے لگا۔ کتاب دوبارہ سالم حالت میں اُس کی بغل میں آ چکی تھی۔ اچانک اُسے دائیں ہاتھ کے ایک مکان کے اوپر والے چوبارے کا بلب جلتا نظر آیا۔ وہ ذرا محتاط ہو گیا کہ جیسے کسی کی نگرانی میں آ رہا تھا۔ اس نے بلب جل اُٹھنے والے چوبارے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ اُسے واہمہ ہوا کہ جیسے کوئی عورت اسے پردے کی درز کے پیچھے سے دیکھ رہی تھی۔ اس جلتے بلب کی مدھم روشنی کا فائدہ یہ ہو رہا تھا کہ اسے جلیل کے گھر کا سبز دروازہ ٹھیک سے دکھائی دینے لگا۔ اُس نے جلیل کی دہلیز پر پہنچ کر لمحے بھر کے لئے سوچا کہ اتنی رات گئے اس کے دروازے پر دستک دی جائے یا نہ دی جائے۔ پھر یہ سوچ کر اُس نے جلیل کا کُنڈا کھڑکھڑایا کہ اُس نے

اُسے بتایا ہوا تھا کہ وہ حلقے کے اجلاس کے بعد اُس کے گھر آئے گا۔ یوں بھی اُسے خیال آیا کہ اب اُلٹے پاؤں واپس جانا کسی چھپی درز سے دیکھنے والے کے لئے وہ کوئی مشکوک شخص ہو سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اُس نے ہلتے پردے کی جانب دوبارہ دیکھا۔ اُسے پردے کے پیچھے دوپٹے کا پلو سا دکھائی دیا۔ اُسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ گھر کس کا تھا۔ وہ اس محلے کے کئی لوگوں کو جانتا تھا۔ اُسے حیرت صرف بلب جلنے اور پردے کے پیچھے سے دوپٹے کے پلو بار بار سرکنے سے ہو رہی تھی۔ نقاش کو تاک جھانک کی عادت کبھی بھی نہ رہی تھی۔ حتٰی کہ تب بھی نہیں جب وہ نوخیز جوان تھا۔ اُسے جلیل کی دہلیز پر کھڑے کھڑے خیال آیا کہ اس کی شاعری میں عشق و محبت اور فراق و وصال کی ساری باتیں جھوٹی تھیں۔ "مگر میری شاعری میں عشق و محبت اور فراق و وصال کی باتیں ہیں ہی کہاں؟ اگر کچھ ہیں بھی تو اکتسابی اور فرضی نوعیت کی ہیں اور کچھ اُن دنوں کی جب اُس کی شادی ہو رہی تھی ۔ اُس نے دستک اب کی بار دروازے کے باہر لٹکی کنڈی کو زور سے کھڑکا کر دی جیسے وہ جلیل سے زیادہ پردے کے پیچھے ہیولے کو بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ کوئی چور اُچکا نہیں۔ "کون ہے؟" بالآخر اندھیرے اور سناٹے کو چیرتی جلیل کی گرج دار آواز سنائی دی۔ "میں ہوں" اُس نے جواب دیا۔ اگلے ہی لمحے پٹ سے دروازہ کھلا اور اندھیری ڈیوڑھی کے پیچھے مدہم سا بلب ٹمٹماتا دکھائی دیا۔ "یہ کوئی آنے کا وقت ہے"، جلیل نے دروازے کا ایک پٹ کھولتے ہوئے نقاش کو اندر آنے کا رستہ دیا۔ "یہ کوئی سونے کا وقت ہے؟" اُس نے کھسیانی اور مزاقیہ ہنسی کے درمیان کی آواز نکالی۔ "کیا وقت ہوا ہے؟" جلیل نے آنکھیں ملتے پوچھا۔ "معلوم نہیں" اُس نے اپنی ہنسی کے بے اعتبارے معیار کو جیسے برقرار رکھنا چاہا۔ جلیل اُسے ڈیوڑھی سے گزارتا اپنے کمرے کے اندر لے آیا جہاں داہنی طرف پرانی طرز کی ایک مسہری بچھی تھی۔ اُس نے بیٹھنے کے لئے جگہ ڈھونڈنا چاہی۔ مسہری کی پائینتی کی جانب ایک کرسی تھی جس کے اوپر ایک ٹی وی دھرا تھا اور اُس کے اوپر ایک وی سی آر جھول رہا تھا۔ نقاش مسہری کی پائینتی کے اوپر دھرے کتابوں کے ڈھیر کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے اپنے لئے جگہ بنا کر بیٹھ گیا۔

اس اثناء میں جلیل صندوقوں کے ایک مینار کے اوپر سے سگریٹ کی ڈبیا اُتارنے میں کامیاب ہوگیا۔ اُس نے دو سگریٹ سلگائے، ایک نقاش کی طرف بڑھایا۔ دروازے کے کھلے پٹ کے اوپر اپنے داہنے ہاتھ کو ٹکائے جلیل اپنا آدھا سگریٹ ختم کر چکا تو اس نے نقاش کو چائے کا پوچھا۔ "چائے کے لئے اماں کو نہ اُٹھانا" نقاش بولا۔ "چائے کا سامان اسی کمرے میں پڑا ہے" جلیل نے موڑھے کے پیچھے بجلی کی ایک کیتلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ نقاش کو کیتلی کے ساتھ دو مگ پڑے نظر آئے۔ جب جلیل کیتلی میں پانی بھرنے اور مگوں کو دھونے کے لئے نکل رہا تھاتو نقاش نے اپنے کھوکھلے قہقہوں کے جلو میں جملہ کسا۔ "آدھی رات کو پانی بھی ہے اور بجلی بھی، اس سے بہتر وقت چائے بنانے کا کونسا ہو سکتا ہے"۔ جلیل اُس کے جملے کو سنا ان سنا کرتا کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ نقاش نے مسہری پر دھری کتابوں کی ڈھیریوں میں سے اپنا شعری مجموعہ نکالا اور اُس کے سرورق کو یوں توجہ سے دیکھنے لگا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ سرورق پر اپنے دوست خلیل الرحمان کی خطاطی پر غور کرتے کرتے اُس کے موٹے ہونٹوں پر اپنی کتاب شائع ہونے کی کامیابی کا احساس ایک بھدی سی مسکراہٹ کی صورت اُبھرا، جسے جلیل نے چائے کی کیتلی اور مگوں کو دھونے کے بعد واپس کمرے میں داخل ہوتے بھانپا۔ "کیا صرف اب اپنی کتاب کو ہی پڑھتے رہتے ہو؟" جلیل نے کیتلی کی تار کو پلگ میں لگاتے ہوئے کہا۔ "اسے بھی کہاں پڑھتا ہوں، بس دیکھتا رہتا ہوں" نقاش نے بدستور سرورق پر نظریں جمائے جواب دیا۔ "اچھا یہ بتاؤ تم کبھی گھر بھی جاتے ہو یا نہیں" جلیل نے ایک دم بات بدلی جیسے ادب اور کتابوں سے زیادہ اہم موضوع وہ اب چھیڑنے جا رہا ہو۔ "مجھے تم یہ بتاؤ کہ تم کبھی گھر سے نکلتے بھی ہو یا نہیں؟" الٹا نقاش نے سوالیہ انداز میں فقرے پر فقرہ کسا۔ "یار، تمہاری کتاب کے علاوہ یہاں پر کتابوں کا ڈھیر لگا ہے، اُن کو پڑھنے کی خاطر آوارہ گردی چھوڑنا پڑتی ہے" جلیل نے بالآخر گرم پانی کو مگ میں اُنڈیلتے جیسے سنجیدگی کو اپنے اوپر تان لیا۔ "یار، شادی کیوں نہیں کر لیتے، اچھا بھلا مکان تمہارے پاس ہے، اور تمہاری بہنیں بھی بیاہی جا چکی ہیں، تمہاری ماں کو رونق چاہیئے"۔

نقاش جلیل پر اپنے جملوں کی بوچھاڑ جاری رکھے ہوئے تھا۔ ''تم جس طرح اپنے بچوں اور بیوی کو خوار کر رہے ہو، میں ایسا نہیں کر سکتا، ویسے تمہارے بیوی بچوں کا بھی حوصلہ ہے جو وہ تمہیں پورا پورا دن، پوری پوری شام اور بعض اوقات تو پوری پوری رات دیکھے بغیر گزار دیتے ہیں، پتہ نہیں تم کس قسم کے باپ اور شوہر ہو'' جلیل بولا۔ ''بھوسڑی کے، جیسی میری زندگی ہے، تم تو کیا بڑے بڑے بادشاہ بھی مجھ سے جلیں۔ میری بیوی اور میرے رشتہ داروں کے آٹھ گھر ہماری گلی میں ہیں۔ وہ سب آپس میں اتنے مصروف رہتے ہیں کہ انہیں میری موجودگی یا غیر موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ میرے بچے بڑے ہوتے جا رہے ہیں، میری بیوی اُستانی ہے۔ بینک کے ہیڈ آفس نے مجھے پی آر او کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ یوں سمجھو کہ وظیفہ لگا ہوا ہے، تمہیں میں جو آزاد چلتا پھرتا نظر آ رہا ہوں تو تم بھوسڑی کے جلتے ہو''۔ نقاش احمد نے عادتاً کھسیانی قہقہوں اور تھوکوں کے آمیزے میں سگریٹ کو پھونکتے اور چائے کی چسکیاں لیتے جیسے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ ڈالی۔ ''جلیل نے اس کے چہرے پر مسلسل نظریں جمائے جواب دیا۔'' چھوڑو روز روز کی بک بک، یہ بتاؤ کہ حلقے کا اجلاس کیسا رہا، کون کون آیا تھا؟'' ''یار، اُس ٹی وی پروڈیوسر کی غزل اچھی تھی، مطلع سنو'' نقاش احمد نے باقاعدہ گنگنانا شروع کر دیا۔ ''واہ اچھا ہے'' جلیل کو نقاش کی گنگناہٹ رات کے اس پہر کسی بھولے بسرے گیت کی طرح لگی۔ ''یار اماں تو سوئی ہوئی ہے ناں!'' نقاش کو گلہ صاف کرتے ہوئے خیال آیا۔ ''اماں دوا کھائے پچھلے کمرے میں سوئی پڑی ہے'' جلیل یوں بولا جیسے وہ اس غزل کو نقاش کی گنگناہٹ میں سننا چاہ رہا تھا۔ ''چلو کافی دیر ہو گئی ہے، صبح دفتر بھی پہنچنا ہے'' نقاش نے گھڑی پر نگاہ ڈالی جس پر رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔

****

نقاش احمد کو صبح دفتر سولہواں سگریٹ پھونکنے اور چائے کا ساتواں پیالہ پینے کے دوران ایم ڈی کا فون آیا اور اُسے فوراً اپنے کمرے میں بلایا۔ ''لگتا ہے تمہیں گورنر آفس

نے اپنے اسپیچ رائٹر کے طور پر چُن لیا ہے"، ایم ڈی نے نقاش کو کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ "تو سر مجھے کیا کرنا چاہئے"، نقاش نے حسبِ عادت ہونق صورت بن کر ایم ڈی کا مشورہ لینا چاہا۔ "جاؤ، جشن مناؤ، وہاں تمہارے تعلقات بنیں گے، ترقی ہو گی"، ایم ڈی نے جواب دیا۔ "مگر سر شاید وہاں کام بھی کرنا پڑے گا"، نقاش نے بے چارگی کا اظہار کیا۔ "یہاں فارغ بیٹھے بیٹھے تھکے نہیں"، ایم ڈی طنزاً بولا۔

اگلے روز نقاش احمد گورنر ہاؤس میڈیا سیل کے سربراہ کے سامنے بیٹھا اُس کی ہدایات سن رہا تھا۔ "سر، مجھے گورنر ہاؤس کی پریس ریلیز اور تقریریں لکھنے کے قابل کیوں سمجھا گیا؟" نقاش احمد نے پنجاب گورنر کے پریس سیکرٹری عزیز احمد سے پوچھا۔ "اس لئے کہ مجھے تم پسند ہو، مجھے تمہاری شاعری بھی پسند ہے، تم پہلے بھی سرکاری ملازم تھے، ہم نے تمہیں ڈیپوٹیشن پر ادھر منگوا لیا ہے"، عزیز احمد نے نقاش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "سر آپ سے پرانا تعلق ہے مگر آپ کے ساتھ کام کرنے سے ڈر لگتا ہے کیونکہ آپ اپنی ٹیم سے کام بہت لیتے ہیں اور میں کام چور ہوں" نقاش نے بے ہنگم سا قہقہ لگاتے ہوئے کہا۔ "تم کام چور ہو، نکمے نہیں، چلو چھوڑو ان بیکار کی باتوں کو، تمہیں تمہارا اسسٹنٹ تھوڑی دیر میں تمہارا کمرہ دکھائے گا، آج سے ہی کام شروع کرو، ایک پریس ریلیز تیار کر کے اپنے اسسٹنٹ کو دو جو گورنر جنرل صاحب کی جانب سے آج سول ہسپتال کے ایک نئے وارڈ کے افتتاح کے سلسلہ میں ہے، تمہارا سیکرٹری تمہیں ساری تفصیلات بتا دے گا۔" "سر، گورنر جنرل سے آپ کی مراد کیا ہے؟"۔ نقاش نے حیرت سے پوچھا۔ "یار اپنے گورنر صاحب فوجی جرنیل بھی ہیں لہذا ہم انہیں گورنر جنرل کہتے ہیں، ویسے انہیں شاعری کا شوق ہے، میں نے انہیں تمہارے بارے بتایا تھا، انہوں نے تمہارا شعری مجموعہ مانگا ہے، کل لیتے آنا" عزیز احمد نے کہا۔

نقاش احمد سب سے پہلے تو اپنے آفس سے متاثر ہوا۔ وہ یہ سوچ کر نروس تھا کہ نوکری میں یہ ترقی اُسے راس بھی آئے گی یا نہیں۔ اُس کا اسسٹنٹ حمید اللہ اپنے لباس

اور حلیے سے اُس کا باس لگتا تھا۔ حمید اللہ چست پینٹ کوٹ اور بلیو شرٹ کے اوپر لال ٹائی باندھے ایک بانکا سا نوجوان تھا جبکہ نقاش احمد بیس سالہ پرانے سفاری سوٹ میں خود کو پُغد سا محسوس کر رہا تھا۔ "سر، آپ کے لئے کافی بھجواتا ہوں چند گھڑی آرام کر لیں، میں جلد ہی آپ کو صاحب کے وزٹ کی انفارمیشن دیتا ہوں۔ قریب پانچ منٹ کی اسپیچ تیار کر دیں جو صاحب گاڑی میں ہی پڑھیں گے، ایک بجے ہم سب گورنر ہاؤس پریس کی گاڑی میں صاحب کے ساتھ جائیں گے، ایک فوٹو گرافر اور ایک وڈیو گرافر بھی ہمارے ساتھ ہوں گے، واپسی پر آپ پریس ریلیز بنا دیجئے گا، میں اور ٹائپسٹ تصویریں، ویڈیو کلپس اور پریس ریلیز میڈیا کو ای میل کر دیں گے" حمید اللہ کی اس ساری بریفنگ نے نقاش احمد پر اُس کے سارے کام کی نوعیت جیسے آشکار کر دی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد نقاش احمد کی گورنر صاحب کے لئے تقریر تیار تھی۔ حمید اللہ نے تقریر پڑھنے کے بعد نقاش کو داد دی، پھر یہ تقریر عزیز احمد کے پاس گئی۔ اُس نے اس کو پڑھنے کے بعد نقاش کو انٹرکام فون پر سراہتے ہوئے کہا۔ "اس پوسٹ پر آنے کے لئے کئی سفارشی تیار تھے مگر میں نے محمد زمان کے انتقال کے روز ہی طے کر لیا تھا کہ اُن کی جگہ میں تمہیں لاؤں گا۔" "سر، مہربانی کیجئے گا، اس پوسٹ پر کہیں میرا انتقال نہ ہو جائے"، نقاش احمد نے حسبِ معمول احمقوں کے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

ہسپتال کے کاریڈور میں گورنر صاحب کے ساتھ اُن کا اے ڈی سی، سکیورٹی آفیسر، چھ سکیورٹی گارڈز، پریس سیکرٹری عزیز احمد، اور ہسپتال کے ڈائریکٹر ڈاکٹر افتخار تھے۔ گورنر صاحب کی پچھلی قطار میں چند اور اسکیورٹی گارڈ، حمید اللہ، نقاش احمد، فوٹو گرافر، وڈیو گرافر، چند صحافی اور ہسپتال کا کچھ انتظامی عملہ تھا۔ گورنر صاحب اور اُن کے عملے کے سبھی افراد کو ہسپتال کے کانفرنس ہال میں لے جایا گیا جو ڈاکٹروں، مریضوں، نرسوں اور علاقے کے عمائدین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ گورنر صاحب اُس کی لکھی ہوئی اور حمید اللہ کے ہاتھوں کی ٹائپ کردہ تقریر کو ایک سبز رنگ کے فولڈر میں رکھے اسٹیج کی جانب رواں ہوئے۔ عزیز اللہ، اے ڈی سی، ڈاکٹر افتخار اور علاقے کا ناظم اسٹیج

پر نمایاں دھری کرسیوں پر گورنر کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ اسکیورٹی گارڈوں نے اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد ڈاکٹر افتخار نے خطبہ ابتدائیہ پیش کیا۔اُس کے بعد گورنر صاحب نے لکھی تقریر کا فولڈر کھولے بغیر بات چیت شروع کی، انہوں نے ہسپتال کی ترقی کو پاکستان کی ترقی اور اسلام کی بلندی سے تشبیہ دینے کے بعد اُن مخیر حضرات کو سراہنا شروع کیا جن کی مدد سے وہ نیا وارڈ تعمیر ہوا تھا، پھر وہ دوبارہ اسلام میں خیرات کی برکت کے پہلو کی طرف آئے، پھر نظم و ضبط کے نکتے پر اُن کی سوئی اٹک گئی اور یہ اٹکی سوئی الباکستان آرمی کے ایک سپاہی کی حیثیت سے اپنی ذات کے اصولوں کی باتیں کرنے کے دوران مزید اٹک گئی۔ پھر انہیں یاد آیا کہ اس سرکاری ہسپتال کا موازنہ شہر میں موجود کچھ ہندو نام کے ہسپتالوں سے بھی کرنا ضروری تھا، اس پر اُن کا کہنا تھا، ”تقسیم کے وقت ہمارے پاس اس شہر میں تین بڑے ہسپتال تھے، گنگا رام ہسپتال، گلاب دیوی ہسپتال اور میو ہسپتال۔ اُن تینوں کو مخیر ہندو خاندانوں نے عوام کی فلاح کے لئے بنایا تھا، اب مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ نئے سے نئے ہسپتال بنائیں۔“ اس طرح کی تقریر ختم کرنے کے بعد وہ ڈاکٹروں اور نرسوں میں سندیں تقسیم کرنے لگے۔ نقاش احمد کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ کیا گورنر صاحب کو اُس کی لکھی تقریر پسند نہیں آئی جو انہوں نے پڑھی نہیں۔ ہسپتال سے واپس گورنر ہاؤس جاتے ہوئے عزیز احمد نے نقاش کو تسلی دی کہ اُسے ہرگز فکر نہیں کرنی چاہئے کیونکہ گورنر صاحب اکثر لکھی ہوئی تقریریں نہیں پڑھتے یا پھر اُن میں سے کچھ حصے پیش کرتے ہیں۔ عزیز احمد نے مزید وضاحت کی ہمیں اُن کے لئے ایک تقریر ہر صورت تیار رکھنی ہوتی ہے۔ ”خیر اب تم نے سارا ایونٹ خود دیکھا ہے، لہذا جاتے ہی ایک پریس ریلیز بنا کر اپنے سیکرٹری کو دے دو۔“عزیز احمد اُسے ہدایت دیتے ہوئے بولا۔

اگلے روز نقاش احمد جب آفس پہنچا تو اُسے حمید اللہ نے اطلاع دی کہ آج گورنر صاحب گورنر ہاؤس کے اندر ہندوستان سے آئے ہوئے سکھوں کے ایک وفد سے ملیں گے اور اس میٹنگ میں اُسے بھی پریس رپورٹر کے طور پر بیٹھنا تھا۔ تھوڑی دیر

بعد وہ، عزیز احمد، حمیداللہ، سکیورٹی اسٹاف، ملٹری گارڈز سکھوں کو خوش آمدید کہنے والی قطار میں کھڑے ہوگئے۔ اس وفد کو جی آیاں نوں کہتے ہوئے نقاش احمد کو دو سال قبل کا اپنا دورہ بھارتی پنجاب یاد آنے لگا۔ وہ پنجابی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ گیا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ واگہ کا بارڈر کراس کرتے ہوئے اُس کی آنکھیں جذبات سے تر ہو گئی تھیں۔ اُس کے وفد میں شامل شاعر، ادیب اور صحافی اُس کی تر آنکھوں کو دیکھ کر اُس کا مذاق بھی اُڑانے لگے اور اُس کی حب الوطنی پر شک کرنے لگے۔ راستے میں جوں جوں وہ امرتسر، جالندھر اور لدھیانہ رکتے گئے، اُس کی طبیعت جذباتی ہوتی چلی گئی۔ ایک جیسی سڑکیں، ایک جیسے لوگ مگر الگ کیسے ہو گئے؟ وہ پورے سفر کے دوران بس کی کھڑکی کے شیشے سے اپنے گال لگائے مسلسل باہر دیکھتے ہوئے سوچتا رہا۔ اُسے جیسے ہندوستانیوں کا دکھ سمجھ آنے لگا، خاص طور پر ہندوستانی پنجابیوں کا جن کا پنجاب اُن سے کاٹ دیا گیا تھا، واہگہ سے اٹک تک اور اٹک سے بہاولپور تک کا پنجاب جو ہندو راج دہانیوں، سکھ گوردواروں اور صوفی درگاہوں کی دھرتی تھا وہ اُن سے کاٹ دیا گیا تھا، پھر راجستھان کے ساتھ ساتھ سندھ کی سرزمین کاٹ دی گئی تھی، یہاں تک کہ بحرِ ہند کے اُس طرف بنگال کو بھی کاٹ دیا گیا تھا۔ بھارتیوں کے لئے یہ بٹوارہ تو ایک ڈاکہ تھا اور جو ڈاکو اس سرزمین کو لے اُڑے وہ ہمارے آباؤ اجداد تھے۔ وہ سوچنے لگا۔ بس جب جالندھر رکی تو وہ کھڑکی سے چھلانگ لگا کر نیچے اترنے کو بے تاب تھا۔ جالندھر اُس کا ننھیال تھا، اُسے یاد آیا کہ اُس کے نانا جالندھر کو یاد کر کے رویا کرتے تھے۔ وہ نانا کے پاس بیٹھ کر جالندھر کی باتیں سنا کرتا تھا۔ اُس کو تب بہت حیرت ہوتی تھی کہ اسکول میں تو وہ جناح کے بارے بڑی عظیم باتیں سنا کرتا تھا مگر نانا جناح کے بہت خلاف تھے۔ ایک دن نانا نے چارپائی پر پڑی اُس کی معاشرتی علوم کی کتاب کے کچھ ورق پڑھنے کے بعد غصے کے ساتھ اُسے زمین پر پٹختے ہوئے اُسے اپنے پاس بلا کر پوچھا۔ ”تمہارے اسکول میں یہ جھوٹی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں؟“۔ ”نانا جی، اس میں جھوٹی بات کیا ہے؟“ اُس نے جواباً حیرت سے پوچھا۔ ”جناح نے یہ ملک ولک نہیں بنایا تھا، وہ تو انگریزوں کا پٹھو تھا“ وہ غصے سے بولے۔ نقاش کو بس سے اترتے اور جالندھر کی زمین

چھوتے ہوئے نانا جی اتنی شدت سے یاد آئے کہ اُس کو اپنی آنکھوں کے تر دیدوں کو ٹشو سے صاف کرنا پڑا۔ جالندھر کے بس اڈے کے باہر ٹین کے صندوقوں کی دکان سے ٹین کی چادر پر مرمت کی آواز دوسرے شہروں کو نکلنے والی بسوں کے کنڈکٹروں کے ہلکاروں میں دب رہی تھی۔ جالندھر سے پٹیالہ نکلنے سے پہلے اُس نے بس اسٹینڈ کے گردا گرد ٹہلتے ہوئے اپنے ننھیال کی سرزمین کو پاؤں سے دل تک محسوس کرنا چاہا۔ ٹہلتے ہوئے اُس کی آنکھوں کے سامنے جیتا جاگتا جالندھر تھا اور ذہن میں مرے نانا کی باتوں کی گونج تھی۔ "جناح کو نہ تو پنجاب، سندھ اور بنگال کے جغرافیے کا پتہ تھا اور نہ ہماری زبانیں آتی تھیں۔ پنجاب میں تو جناح ڈرتے ہوئے گھستا نہیں مگر انگریزوں نے اُس کو استعمال کرکے پنجاب کے اس طرح دو ٹکڑے کیئے کہ یہاں خون کی ندیاں بہہ گئی تھیں"۔ اُس کو نانا کی بات یاد آئی اور ساتھ اپنا سوال بھی یاد آیا جو اُس نے تب کیا تھا، "نانا، مجھے تو ہمارا ماسٹر بتاتا ہے کہ آپ لوگوں نے پاکستان بہت قربانیوں کے بعد بنایا تھا، تو یہ کیا سچ نہیں تھا؟" "یہ سب جھوٹ ہے، تمہاری کتابوں میں یہ سارا جھوٹ لکھا ہوا ہے، جس جھوٹ کو پڑھ کر تمہارا ماسٹر ماسٹر بنا ہے اور وہ اب اس طرح کی جھوٹی باتوں کو سچ سمجھ کر لکھے گا اور پھر تمہاری نسل اور تمہارے بعد آنے والی نسلیں اس جھوٹ کو قرآن کی طرح سچ سمجھ کر اپنے گلے لگائیں گی" نانا کے منہ سے اب غصے کی جھاگ نکل رہی تھی۔ "تو پھر آپ کیوں الپاکستان آئے؟" اس نے جھنجھلاتے ہوئے آخری وار کیا تھا۔ "اس لئے کہ تمہارے جناح نے میرے پنجاب کو آگ لگا تھی۔ ادھر کے پنجاب سے ہندووں سکھوں کی لاشوں سے بھری ٹرینیں جب واگہ کے پار پہنچیں تو پھر اُس پار سے بھی چھرے کلہاڑیاں باہر نکل آئیں۔ بس اُسی بھگدڑ میں میں بھی تمہاری نانی، ماں، خالہ اور ماموں کو لے کر نکلا۔ تمہارا ماموں اور خالہ تو رستے میں کاٹ دیے گئے، بس شکر کرو کہ تمہاری ماں اور نانی میرے ساتھ زندہ واگہ پار کر کے آ گئے۔ اب میں نہ واپس جانے جوگا اور نہ یہاں رہنے کے قابل"، یہ کہتے ہوئے نانا اپنے بیٹے اور بیٹی کی یاد میں دھاڑیں مار مار کے رونے لگا تھا۔ نقاش احمد واپس بس کے اندر چڑھتے ہوئے سوچنے لگا کہ تب بچپنے میں اپنے سامنے ایک بوڑھے شخص کو یوں دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھ

کر اُس کا ننھا سا جی دہل گیا تھا اور اب ادھیڑ عمری میں اُس کا یہ ننھا جی بوڑھے نانے کی طرح رونے لگا۔ پروفیسر لطیف بھٹی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا، "نقاش احمد، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خواہ مخواہ ہی جذباتی ہوئے جا رہے ہو۔ ان سکھوں ہندوؤں کی باتوں میں آ رہے ہو، پاکستان ایک اٹل حقیقت ہے، اس کے وجود پر کوئی سوال کسی قسم کے معنی نہیں رکھتا۔ الباکستان ہم مسلمانوں کا گھر ہے۔" "مگر پروفیسر، ہندوستان بھی مسلمانوں کا گھر ہے، ہم نے الباکستان بنا کر مسلمانوں کو کیوں کاٹا"، اُس نے آنکھوں کو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ بات ہم پاکستان جا کر کریں گے، یہاں ہم میں سے کسی کو اپنی جذباتی کمزوری نہیں دکھانی چاہئے" پروفیسر نے گروپ لیڈر کی حیثیت سے اب ذرا حکمیہ لہجہ میں کہا۔ نقاش احمد پروفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کے ساتھ واپس بس کی طرف چل پڑا تھا۔

اس روز گورنر ہاؤس میں سکھوں کے وفد کا استقبال کرتے ہوئے اُسے پھر پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کا ایک پروفیسر یاد آیا جو خالصتان اسٹیٹ بنانے کی بات کر رہا تھا، اگرچہ اُسے اپنے دورہ کے دوران خالصتان کی بات کرنے والے دو تین لوگ ہی ملے تھے جن میں ایک وہ پروفیسر بھی تھا۔ اُس نے پروفیسر کو بیچ میں ٹوکتے ہوئے کہا تھا، "مہاراج، دھرم کے نام پر زمین کو توڑنے کی بات نہ کرو، پہلے ہم مسلمانوں نے 1947 میں انڈیا کا مذہب کے نام پر بٹوارہ کیا تھا تو سب سے زیادہ خون پنجاب میں بہا تھا، اب آپ اپنے سکھ دھرم کے نام پر بٹوارے کی بات کرتے ہو تو خون خرابے کی کیوں صورت نکالتے ہو" اُس کی اس بات پر ہال میں تالیاں بجیں، سب پروفیسروں نے اُس کی بات کو سراہا مگر الباکستانی وفد نے اُسے انتہائی ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ اب گورنر ہاؤس کے اندر سکھ وفد کو چائے پیش کرنے کے بعد گورنر صاحب پنجابی میں خطاب کر رہے تھے اور یقین دلا رہے تھے کہ سکھوں کی مقدس جگہوں کی حفاظت الباکستان کی ذمہ داری ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شہر میں سینکڑوں گردواروں کو گرایا جا چکا تھا اور ابھی بھی گورنر صاحب ڈھٹائی کے ساتھ بلندوبانگ دعوے کر رہے تھے۔ پھر

گورنر صاحب ہندوستان کی حکومت کی جانب سے سکھوں پر مبینہ ظلم کا قصہ چھیڑنے لگے تو ایک بزرگ سکھ نے اُنہیں ٹوکا، "سر میرا خیال ہے کہ پالیٹکس پر بات رہنے دیں، ہم آپ کے مہمان ہیں اور آپ کے شکرگزار ہیں کہ آپ ہماری ننکانہ صاحب یاترا کی مدد کر رہے ہیں، ہمارا مکہ آپ کے پاس ہے سو ہم آپ کے پاس آئے بنا رہ نہیں سکتے۔" گورنر صاحب اپنے اسٹاف کو سکھوں کی ننکانہ یاترا کی تلقین کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کے ساتھ تصویریں کھنچوانے لگے، نقاش احمد فوٹوگرافر کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ پریس ریلیز کے لئے نوٹس لکھنے لگا۔

☼☼☼☼☼

چودھواں باب

کارگل کی لڑائی کی یاد میں ایک گیت

2018ء

بریگیڈئیر شوقین، کرنل شامت، نقاش احمد، ہما نیوز کاسٹر، صحافی جلیل احمد اور ملک کے لاکھوں کروڑوں عوام کارگل لڑائی کے کئی سالوں بعد 'اے راہِ حق کے شہیدو' والا ترانہ نئی ماڈرن ڈھنوں کے ساتھ کوک اسٹوڈیو کی جانب سے ریلیز ہونے کے بعد ٹیلی ویژن اور یو ٹیوب پر صبح شام دیکھ رہے تھے۔اس ترانے کو ریٹائرڈ بریگیڈئیر آصف نے ری کمپوز کروایا تھا اور ایک درجن سے زائد اُن نئے گانے والے اور گانے والیوں کو اس خیال کے ساتھ اس ترانے میں استعمال کیا تھا کہ ان کا داخلہ ہندوستان میں بند ہو جائے۔ اب آصف گانے والوں اور گانے والیوں کو بہت شوق سے دیکھ رہا تھا۔ پاکستانی گلوکاراؤں اور خاتون فنکاراؤں کے بارے بریگیڈئیر کا اندازہ تھا کہ انہیں ہندوستان میں بہت پسند کیا جاتا تھا اور یہ سوچ کر اکثر اُس کی باچھیں کھل جاتی تھی کہ پاکستانی لڑکی، چکن بریانی اور اردو غزل پر ہندوستانی فدا ہو جاتے تھے۔ آصف کو بھارت کے سکھوں اور ہندوؤں کی نفسیاتی کمزوری کا اندازہ تھا۔ سکھ تو ننکانہ صاحب، پنجہ صاحب اور پورے پنجاب پر ہی فدا تھے، لہٰذاوہ پاکستان کی والی وارث پنجابی فوج کے بھی عاشق تھے۔ پاکستانی فوج کے ایک میٹھے بول پر وہ تقسیم کے سارے دُکھ بھول جاتے تھے۔ اب ویسے بھی تقسیم کے بعد کی دوسری تیسری نسلیں آچکی تھیں جن کو تقسیم کی سیاہ کاریوں کا اندازہ

ہی نہیں تھا۔ آصف کو میڈیا پر لگائی گئی اپنی اُن محنتوں پر ناز محسوس ہو رہا تھا جن کی مدد سے وہ بھارت کی سیکولر اور لبرل عوام پر یہ باور کرانے میں کافی حد تک کامیاب ہو چکا تھا کہ پاکستان تو خود کو اسلامک ریپلک ہی کہلوائے گا مگر بھارت کو ہندو دیش کی بجائے سیکولر دیش دیکھنا چاہے گا۔ نیز یہ بیانیہ بھی بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ پاکستان تو امن چاہتا تھا مگر بھارتی حکومت امن نہیں چاہتی۔ اُس نے بھارت کے ٹاپ صحافیوں، لکھاریوں اور بالی وُڈ کے نامور فنکاروں کے پاکستان میں ہائی پروٹوکول کے ساتھ دورے کروائے تھے جن میں پاکستان کی ایلیٹ کلاس لڑکیوں کو میزبانی کے فرائض سونپے گئے تھے۔ اب یہ بھارتی صحافی، لکھاری اور فنکار امن کی آشا کے گیت گاتے نہیں تھکتے تھے اور پاکستان کی میزبانی کے صبح و شام گُن گاتے تھے۔ آصف نے اس امر کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا تھا کہ دونوں طرف کے لیفٹ کے نام نہاد شوقین فنکاروں، لکھاریوں، شاعروں اور صحافیوں کو آپس میں ملایا جائے تاکہ پاکستان کا سیکولر رُخ پیش کیا جائے اور ہندوستان کا ہندوتوا رُخ دونوں طرف کے لیفٹ کی ملاقاتوں میں پیٹا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ بریگیڈیئر آصف کرنل عارف کے ذریعے لشکرِ طیبہ، جیشِ محمد اور حرکت النصار کے ذریعے متواتر کشمیر میں دہشت گردی کی کارروائیاں کرواتا رہتا تھا۔

کرنل عارف عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد ٹی وی کے سامنے بیٹھا تھا اور دن میں کئی بار چلنے والے ملی گیت کی ان لائنوں میں کھو گیا، "اے راہ حق کے شہیدو، چلے جو ہو گے شہادت کا جام پی کر تم، رسول پاک نے بانہوں میں لے لیا ہو گا"۔ اُسے اپنا دوست کرنل مجاہد یاد آیا جو اس جنگ میں شہادت کا جام پی گیا تھا، اب وہ تصور کر رہا تھا کہ اُسے رسولِ پاک نے اپنی بانہوں میں لے لیا ہو گا۔ نقاش احمد نے اس پرانے ملی گانے کا نیا روپ سنتے ہوئے غور کیا کہ ملک میں بڑھتی اینٹی شیعہ مذہبی جنونیت کے ماحول میں 'علی تمہاری شجاعت پر جھومتے ہوں گے حسین پاک نے ارشاد یہ کیا ہو گا، جنابِ فاطمہ جگر رسول کے سامنے، شہید ہو کے کیا ماں کو سرخ رو تم نے، جناب حضرت زینب گواہی دیتی ہیں جیسی لائینیں' سپاہ صحابہ اینڈ کمپنی کو زیادہ پسند نہیں آئی ہوں گی۔

جھنگوی گروپ کے کچھ لوگ اس ملی ترانے کی نئی دھن سنتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ بہتر ہوتا کہ کسی اور گیت کو گایا جاتا، اس میں شیعہ ازم کچھ زیادہ ہی ہے۔ مولانا گوندلوی کو امجد صابری پر غصہ آ رہا تھا، اُس کو علی علی گانے والے اس ملعون کو مارنے کا جی چاہ رہا تھا۔ امام کاظمی کو یہ نئی دھن بہت پسند آئی۔ اس کو سن کر پاکستان میں اینٹی شیعہ ماحول کا کچھ گلہ جاتا رہا اور اُس کا بھی جی چاہا کہ ہندوستان کے خلاف جہاد میں اپنے کچھ شاگرد بھیجنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ویسے بھی کشمیر اور فلسطین میں جہاد کے خیال سے وہ جماعت اسلامی کا ہمنوا ہو جایا کرتا تھا۔ ہما نیوز کاسٹر کو 'شہید ور کھی ہے بہنوں کی آبرو تم نے، وطن کی بیٹیاں مائیں سلام کہتی ہیں' والی لائینیں بہت بُری لگی تھیں۔ اُس کے خیال اور تجربے کے مطابق قوم کے مجاہدوں کو بہنوں بیٹیوں کی آبروؤں کا رَتی بھر بھی احساس نہیں تھا۔ صحافی جلیل احمد کو یہ ترانہ سنتے ہوئے اور خاص طور پر یہ لائن سنتے ہوئے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ بھلا 'چمن کی فضائیں سلام کہتی ہیں' کس کو کہتی ہیں؟ اور کونسا چمن؟ جس میں پوری قوم جھوٹ کے ایندھن میں جل رہی ہے، اس کو چمن کہتے ہیں نام نہاد راہِ حق کے جھوٹے دعویدار۔ پوری قوم اپنے جذبہ ایمان اور شوقِ شہادت کو تروتازہ کر رہی تھی۔

*****

2003-2018ء

ریٹائرڈ بریگیڈیئر آصف اور کرنل عارف نے جب 2018 میں سن دو ہزار دو سے سولہ سال کے چیدہ چیدہ واقعات کی ڈائری لکھنا شروع کی تو کچھ یوں تھی:

"دو ہزار تین دسمبر کے مہینہ میں جنرل اشرف پر دو قاتلانہ حملے ہوئے، دونوں ناکام ہوئے۔ اسی سال شیعہ عبادت گاہوں پر چند حملے ہوئے جن میں چند ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 2004 میں شیعہ سنی فسادات بھڑکے اور زیادہ تر شیعہ ہلاک ہوئے۔ 2005 اور 2006 میں دہشت گردی کے واقعات اور بڑھے۔ 2007 میں دہشت

گردی کے واقعات 1500 سے اوپر ہوئے جن میں ساڑھے تین ہزار سے زائد لوگ ہلاک اور 5000 سے زائد زخمی ہوئے۔ لال مسجد کا واقعہ اور بے نظیر بھٹو کا قتل بھی اسی سال ہوتا ہے۔ 2008 کا سال دوہزار سے زائد دہشت گردی کے واقعات لے کر آیا، جن میں ڈھائی ہزار کے قریب لوگ مارے گئے اوراس سے زیادہ لوگ زخمی ہوئے۔ 2009 میں دہشت گردی کے واقعات چھبیس سو کے قریب ہوئے اور تین ہزار سے زائد لوگ مرے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد ساڑھے سات ہزار تک پہنچی۔ 2010، گیارہ، بارہ اور تیرہ میں دہشت گردی کے واقعات میں اتنی شدت آئی کہ اُن کا ریکارڈ رکھنا بھی ممکن نہ رہا۔ 2014، پندرہ، سولہ اور سترہ میں دہشت گردی کی کارروائیوں میں کمی واقع ہوئی۔"

اب ریٹائرمنٹ کے بعد دونوں فوجی فسران 2018 میں موٹے موٹے واقعات کو لکھتے کہیں کہیں وکی پیڈیا کا بھی سہارا لیتے ہوئے نوازشریف کی وطن واپسی اور بے نظیر کے قتل کے حالات یوں بیان کرتے تھے کہ جب فوج کے اندر جنرل اشرف کی مقبولیت میں کافی کمی واقع ہوئی تھی تو آئی ایس آئی کے سرکردہ لوگوں نے کچھ کور کمانڈروں کی مشاورت سے چوہدری جج کی بحالی عدلیہ مہم کو آگے بڑھایا تھا۔ جنرل اشرف کے مخالف جرنیلوں کو جنرل موصوف کے ارادوں کا علم تھا۔ جنرل اشرف جنرل ضیاء الحق سے بھی لمبے عرصے کے لئے براجمان رہنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ان کی حرکتوں کی وجہ سے فوج میں بے چینی پھیل رہی تھی۔ بلوچ رہنما اکبر بگٹی پر جنرل اشرف کے قاتلانہ حملے نے بلوچستان کی صورتحال کومزید خراب کر کے رکھ دیا تھا۔ مختلف کورکمانڈروں نے آئی ایس آئی کو سگنل دیا کہ نوازشریف اور بے نظیر کے مابین بیرون ملک صلح کروادی جائے تاکہ جنرل اشرف کو واضح پیغام ملے کہ فوج کی اکثریت کیا چاہتی تھی۔ جنرل اشرف کے مخالف جرنیل لال مسجد پر حملوں کے بھی حق میں نہ تھے کیونکہ لال مسجد کے لوگ تو فوج کی جہادی کارروائیوں کا اثاثہ تھے۔ فوج کے اس بلاک نے ابھرتے ہوئے مقبول سیاستدان کپتان خان کو ایک طرف میدان میں اتارا تاکہ جنرل اشرف

پر دباؤ پڑے اور دوسری طرف نواز شریف کو بھی یقین دہانی دلا کر بحالی جمہوریت کی مہم چلا دی۔ پیپلزپارٹی کے مشہور چوہدری بیرسٹر کو بھی اس کام پر لگا دیا گیا تھا۔ جنرل اشرف نے جب تینوں بڑی پارٹیوں کے ہرکاروں کو میدان میں اپنے خلاف اترتے دیکھا تو انہوں نے مٹی پاؤ جماعت اور مہاجر بلاک سے مدد مانگی۔ مٹی پاؤ جماعت نے تو جنرل اشرف کو صاف مشورہ دیا کہ اب ان کی ریٹائرمنٹ کا وقت آ گیا تھا۔ البتہ مہاجر جماعت جنرل اشرف کے جھانسے میں آ گئی۔ ہر طرح کے مولوی بھی جنرل اشرف کے خلاف نکل پڑے تھے۔ جنرل اشرف نے مغربی دنیا اور پاکستانی عوام کو بہت باور کرانے کی کوشش کی کہ اس کی شراب و کباب لبرل حکومت کو نہ جانے دیا جائے مگر دن بدن حالات اس کے خلاف ہی جاتے چلے گئے۔ آخر کار اٹھارہ گست 2008 کو وہ مستعفی ہو گیا۔ فوج نے نئے سیٹ اپ کے ساتھ پیپلزپارٹی کی مائنارٹی حکومت بنا دی۔ کہا جاتا تھا کہ اس سے پہلے آئی ایس آئی کا ایک خصوصی باغی دستہ جنرل اشرف کی نگرانی میں بے نظیر کو بھی مروانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

✼✼✼✼✼

2018ء

الباکستان عجیب جذباتی سوسائٹی تھی جس میں ہر شخص شدید جذباتی پیچ و خم کا عادی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہر کوئی ایک دوسرے سے جھوٹ بول رہا تھا۔ نیز اس سوسائٹی کے لوگ کسی ایک جگہ نہیں رہتے تھے۔ آج کے گلوبل دور میں اس سوسائٹی کے افراد دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان افراد کو تشخص کے بحران کا عارضہ تھا۔ کبھی یہ مہا بھارت کا حصہ تھے، آج یہ الباکستان کے چشم و چراغ ہیں۔ 1947 سے یہ اپنی شناخت بنانے کے چکر میں اپنی اصل شناخت کو بھول کر کئی اور شناختوں کی بھول بھلیوں میں پڑ چکے تھے۔ ان کے بنگالی ساتھی ان سے جدا ہو چکے تھے۔ پنجابی مسلمانیت کے چکر میں ایسے پڑے کہ نہ وہ پنجابی رہے اور مسلمان بنتے ہوئے جعلی جعلی سے لگتے تھے۔ پٹھان

پٹھان نہ رہے، بلوچ سرداروں اور غداروں میں بٹ چکے تھے۔ سندھی مسلمان بنتے بنتے اپنے ہندو ورثے کو بھی بھول گئے۔ مہاجر ملک بنانے کا خالی دعویٰ کرتے کرتے تھک چکے تھے مگر ملک والوں نے ان کو کبھی گلے نہ لگایا۔ اب ان کی گلیوں محلوں میں فوجی ٹینکوں کی بھرمار تھی۔ نیا پاکستان کا نعرہ لگانے والا کپتان خان بالآخر وزیراعظم بن چکا تھا۔ الباکستان کو حسبِ معمول بے پناہ مسائل درپیش تھے۔

☼☼☼☼☼

پندرہواں باب

ناول نگار کا اپنا کردار

اب ناول کے بیچ میں ناول لکھنے والے کی حیثیت سے میرا اپنا کردار آتا تھا۔ میں ناول لکھنے والے کے طور پر ایک مبصر صحافی کے ناطے براہِ راست اپنا کردار پیش کرتا ہوں۔ میں اپنے بچپن سے الباکستان اور بھارت کے ایک سرحدی شہر قصور میں رہتے ہوئے کبھی بھی دونوں ملکوں کی تقسیم سے خوش نہیں ہوا تھا۔ مجھے کبھی بھی مذہب کی بنیاد پر پاکستان کی فوجی قیادت کی انتہا پسندی اور دہشت گردی سے اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میں زمانے کے حادثات سے گزرتا ہوا 1999 سے کینیڈا کے ایک پُرسکون شہر میں صحافتی سطح پر حسبِ معمول ایک ہنگامہ خیز زندگی بسر کر رہا تھا۔ انہیں ہنگاموں میں مجھ سے ایک واقعہ ایسا سرزد ہوا جس کا اثر کینیڈا سے ہزاروں میل پیچھے رہ جانے والے بھارت و الباکستان پر اس قدر پڑے گا، اُس کی انتہا کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ میں نے اپنے ٹی وی شو میں طارق فتح کے بھارت و الباکستان مسائل پر کچھ انٹرویو کئے جو بھارت و الباکستان میں وائرل ہو گئے اور طارق فتح دیکھتے ہی دیکھتے بھارت کے اسٹار کمینٹیٹر بن گئے۔ اب میں کینیڈا کے اسی پُرسکون شہر میں اپنے چھوٹے سے گھر میں بیٹھے ٹی وی پر بھارت کے سب سے معروف شو 'آپ کی عدالت' میں طارق فتح کا انٹرویو رجت شرما کے ساتھ دیکھ رہا تھا جس میں طارق فتح اپنے اس ہُنر کو عروج پر لے گئے تھے کہ کس طرح ہر طرف اپنی غلیل چلاتے رہنے سے خبروں کی دنیا میں زندہ رہ سکتا تھا۔ ایک

سال پہلے رجت شرما کے اس شو کی اکیسویں سالگرہ کے ایک گرینڈ فنکشن میں بھارت کے تین سُپر اسٹار خان یعنی شاہ رُخ خان، سلیمان خان اور عامر خان مدعو تھے۔ تینوں خان میرے پسندیدہ اداکار ہیں۔ تینوں کی بات چیت پرائم منسٹر مودی اور بی جے پی کے ایک اہم لیڈر امت شاہ بھی سن رہے تھے۔ تینوں خان اسٹارز بھارت کی سیکولر ویلیوز کے پرچارک تھے مگر تینوں شاید اس بات کو سمجھنے سے بھی قاصر تھے کہ سیکولرزم کا مطلب ہندوستان کی مسلمان کمیونٹی کے کٹر ملاؤں کے شریعہ قوانین کو لاگو رکھنے کا نام نہیں تھا بلکہ ہندوستان کی سبھی کمیونٹیوں کو مذہبی قوانین کے شکنجے سے نکالنے کا نام تھا۔ ان تینوں کی باتوں پر میں یہاں کینیڈا میں بیٹھ کر تبصرہ کرتا تھا جن کی تینوں کو خبر بھی نہ ہوتی تھی مگر یوٹیوب پر میرے ہندوستان بھر میں پھیلے مداحین، میرے تبصرے پسند کرتے تھے جبکہ الباکستان کے اکثر باسی اُن کو ناپسند کرتے تھے۔ البتہ پُرسکون کینیڈا میں رہتے ہوئے مجھے یہ سوچ کر کچھ بے سکونی کا احساس رہتا تھا کہ آئی ایس آئی کا کوئی ایجنٹ مجھے ہر طرح سے نقصان پہنچانے کی کوشش میں لگا ہو گا یا پھر بڑھتی ہوئی الباکستانی کمیونٹی میں سے آئی ایس آئی کے ہزاروں ہمدردوں میں سے کوئی شخص میرے خلاف کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا۔ بدقسمتی سے کینیڈا کے سیاستدانوں یا قانون نافذ کرنے والے ادارے آئی ایس آئی کی گھناؤنی حرکتوں کا ادراک کرنے سے قاصر تھے۔ ٹورونٹو، مسی ساگا اور برامپٹن کے میونسپل، صوبائی اور وفاقی سیاستدان الباکستانی کمیونٹی کے ووٹ بینکس کے بھوکے تھے اور یہ بھی حقیقت تھی کہ الباکستانی کمیونٹی کے اسلام پسند کینیڈین سیاستدانوں کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھے۔ وہ خطرہ تو میرے جیسوں کو تھا جو آئی ایس آئی پر تنقید کرتے تھے۔ ہم میں سے کسی ناقد کا مارے جانا، کینیڈین سیاستدانوں کی نظر میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ الباکستان کے ٹورونٹو میں قونصل جنرل الباکستان آرمی کے ہمدرد ہزاروں لوگوں سے کہتے تھے کہ پاکستانی نظام پر تنقید کرنے والوں کا سوشل بائیکاٹ کرو، ان کے ساتھ کاروبار بند کر دو اور ہو سکے تو اُن کو پھینٹی بھی لگاؤ۔ پاکستان قونصل جنرل کی جانب سے ان دھمکیوں کے خلاف آواز اٹھانے والے میرے جیسے جب کینیڈا کے قانون

نافذ کرنے والے اداروں کے پاس جاتے تو کافی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے پولیس اُن کی شکایت درج نہ کرتی تھی۔ لبرل اور این ڈی پی کے سیاستدان ہم جیسوں سے ملنے سے کتراتے کہ کہیں ان کے ووٹ نہ کم ہو جائیں۔ حتٰی کہ کنزرویٹو پارٹی کے اندر بھی الباکستانی فوج اور آئی ایس آئی کے حامی اپنی جگہ بنا چکے تھے۔ کینیڈا کے بڑے شہروں میں کینیڈین سیاست کا ایک اور تاریک دور تب شروع ہو ا تھا جب الباکستان فوج کے حامی الباکستانی نژاد ایم پی، ایم پی پی اور سٹی قونصلر منتخب ہونا شروع ہوئے۔ انگلینڈ کی طرز پر انہوں نے کینیڈین اقدار کا بھی جنازہ نکالنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆☆

مجھے کینیڈا کے ایک پر سکون شہر میں رہتے ہوئے الباکستان کے وہ ماہ و سال یاد آنے لگے جب میں بہت شاعرانہ قسم کی دنیا میں رہا کرتا تھا۔ الباکستان کے پہاڑی پُرفضا مقامات کی سیر کو نکلتا تھا تو راہ پڑتے پرانے گرجا گھروں، ٹوٹے مندروں اور قفل پڑے گردواروں کو دیکھ کر افسردہ ہو جایا کرتا تھا۔ بھارت کی فلموں اور گانوں میں سارے الباکستانیوں کی طرح میں بھی جیا کرتا تھا۔ اسکول کی کتابوں سے لے کر روزانہ کے اخبارات بھارت اور ہندووں کے خلاف نفرت سے بھرے پڑے ہوتے تھے۔ مجھے اس نفرت کی سمجھ نہ آتی تھی۔ مجھے پورے کا پورا الباکستان بھارت کی دھرتی کا کٹا ہوا بازو محسوس ہوتا تھا۔ بھارتی فلموں میں نظر آنے والے میری زبان اور میرے جیسا رہن سہن رکھنے والے لوگوں سے میں ایک بے لوث سی محبت کا جذبہ اپنے اندر محسوس کرتا تھا۔ پھر جب میں الباکستان کی درسی کتابوں میں چھپے جھوٹ اور کھوکھلے دانشوروں کی سطحی اسلامی سوچ کو سمجھ گیا تو مجھے الباکستان کا پورا ڈھانچہ کھوکھلا دکھائی دینے لگا تھا۔ اوپر سے الباکستان میں بڑھتی اسلامی انتہا پسندی کے غرور، دہشت گردی کا کاروبار، ہر طرح کی اشرافیہ کے اندر کا جعلی پن کھلتا چلا گیا تو قومیتوں کے اوپر ہونے والے ظلم کی بھی سمجھ آنے لگی۔ الباکستان سے بنگلہ دیش کے بننے کے عمل نے نام نہاد دو قومی نظریے کا

بھی جنازہ نکال دیا تھا۔ میں کبھی بھی اپنے بارے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں الباکستانی ہوں۔ میں تو پنجابی تھا اور پنجابی ہوں اور پنجابی ہونے کے ناطے پکا بھارتی ہوں۔ الباکستان تو میری ایک سابقہ سیاسی باؤنڈری تھی۔ میری شناخت نہیں تھی۔ مگر الباکستانی قوموں نے اپنی تہذیبی شناخت کو چھوڑ کر یا تو اسلامی امہ کا ڈھونگ رچا لیا تھا اور یا پھر الباکستانی کہلوانے لگے تھے۔ تاہم آج سے تیس پینتیس سال پہلے یعنی 1985 کے آس پاس الباکستان میں جماعت اسلامی کی تھوڑی بہت سماجی دہشت گردی کے علاوہ دیگر دہشت گردی کے نمونے نہیں تھے۔ آبادی بھی آج کی نسبت کم ہوتی تھی۔ الباکستان کے ٹی وی ڈرامے، الباکستان کی غزلیں، بھارت کی فلمیں اور گیت، مقبول انگریزی گانے اکثر لوگوں کی طرح میری تفریحی زندگی کا اہم حصہ ہوتے تھے۔ میرے تب کے احساسات و جذبات کے پیچھے معاشرے کے وہی ثقافتی اظہار تھے۔ پہاڑوں وادیوں کے راستے اور فضائیں مجھ جیسے شہری لوگوں کے لئے جنت کا سماں ہوتی تھیں اور جنت کے اس سماں میں لڑکوں کے لئے لڑکیوں اور لڑکیوں کے لئے لڑکوں کا ساتھ تخیلاتی اور حقیقی، زندگی کے ہر رنگ کے لئے بہت قدرتی سمجھا جاتا تھا۔

*****

کینیڈا کے سکون کو اگر میں تیس پینتیس سالہ پرانے سکون کے دنوں سے جوڑوں تو نتھیا گلی سے بارہ کلومیٹر دور کا ایک پہاڑ یاد آتا تھا جس کے اوپر بنے گیسٹ ہاؤس میں ایک بار میں ٹھہرا تھا، رات کو نیچے وادی میں بے شمار جگنو نظر آتے تھے اور دن کو نیلی اور لال چونچوں والے پرندے۔ اس قدر پرسکون ماحول میں ایک دوپہر کو وادی کے نیچے سے ایک ٹرانسسٹر ریڈیو سے ہندی فلم کا ایک مشہور گیت 'آج پھر جینے کی تمنا ہے آج پھر مرنے کا ارادہ ہے' بجتا سنائی دیا تو وادی کے انتہائی پُرسکون ماحول میں جیسے جذبات کے ہارمونز ہر سو پھیل گئے تھے۔ میں نے پہاڑ کی چوٹی پر بنے اُس گیسٹ ہاؤس کی ریلنگ سے لگ کر نیچے وادی کی طرف نگاہ دوڑائی کہ شاید بھارت کی

وہ عظیم اداکارہ وحیدہ رحمان نظر آجائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بھارت کی فلم، آرٹ، موسیقی، سیاست اور ہر شعبے میں مسلم ہندو سبھی سیکولر تھے۔ اب 2018 میں ہندو، ہندو ہوتے جا رہے تھے اور مسلمان تو بہت ہی زیادہ مسلمان بنتے جا رہے تھے۔ عامر خان، سلمان خان، شاہ رُخ خان اور نصیرالدین شاہ بھی 'ڈکٹم ہڈ کارڈز' کھیلنے لگے تھے اور پڑھے لکھے ہندو اس پر مزید رد عمل کا اظہار کرتے تھے۔ میری ہندوؤں کے ساتھ بہت زیادہ ہمدردیاں تھیں ایک تو یہ کہ کٹر مسلمان ان کو کافر کہہ کر رد کرتے تھے، دوسرا بھارت صدیوں سے اُن کے شکنجے میں رہا تھا۔ میں مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے اسلام کی جکڑبندیوں سے کماحقہ واقف تھا۔ لیکن میں کبھی بھی خود کی پرائمری شناخت اسلام کے ساتھ منسوب نہیں کرتا تھا بلکہ خود کو ہندو جان کے شانت محسوس کرتا تھا۔ مجھے ہندودھرم زمین اور تہذیب کا دھرم محسوس تھا جو پانی کی طرح اپنا رنگ روپ ہر برتن کے مطابق دھار لیتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھارت کی تقسیم کبھی بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ تاریخ کا پہیہ الٹا چلانا اگر ناممکن نہیں تو آسان بھی نہیں، مجھے تو الباکستان بھی گوارہ ہو جاتا اگر یہ بھارت کے اچھے ہمسائے کے طور پر ساتھ رہتا۔ لیکن نفرت اور دہشت گردی کے اس نگر نے مجھے ہمیشہ سے اداس کئے رکھا تھا۔ خیر ذکر ہو رہا تھا وحیدہ رحمان کے اس نغمے کا جو نیچے وادی میں کوئی سن رہا تھا۔ میں ریلنگ کے اوپر سے جھک کر نیچے وادی کے کسی گھر سے کسی لڑکی کو ڈھونڈنے لگا جو وحیدہ رحمان جیسی ہو اور سوچنے لگا کہ کیا پتہ وحیدہ رحمان ہی ہو۔ انسان بھی کیا چیز ہے، سیاسی حادثے ہوں، معاشرتی نفرتیں ہوں، اقتصادی مسائل ہوں، جذبات اور تخیلات کے دھارے ساتھ ساتھ ہی بہتے رہتے ہیں۔ یووال حریری کی کتابوں کے مطابق تو جذبات اور تخیلات کے دھاروں کو ہارمونز کی کیمسٹری کے ذریعے جلد قابو کر لیا جائے گا۔ وہ ٹھیک کہتے ہیں مگر میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ جذبات اور تخیلات کے دھارے ہارمونز کی کیمسٹری کو نہ صرف بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں بلکہ ہارمونز کے ٹیکوں کا ستیاناس کر سکتے ہیں۔ پھر جس طرح ہر انسان کی اپنی خاص شکل و صورت ہوتی ہے اسی طرح اس کی

کیمسٹری بھی خاص ہوتی ہے۔ انہی سوچوں میں خلط ملط کبھی میں کینیڈا کے سکون کو محسوس کرتا، کبھی تیس پینتیس برس پہلے کے الباکستان کو یاد کرتا اور کبھی کینیڈا میں پھیلتے الباکستانی مائنڈ سیٹ پر دکھی ہوتا اور کبھی ایک بھارت کے خواب دیکھتا، بھلے سے ملک الگ الگ رہیں مگر ایک یورپ کی طرح ایک بھارتی تہذیب والی قومیں ایک ساتھ پُر امن رہ سکیں۔ مجھے اور بہت سوں کو بخوبی اندازہ تھا کہ اس امن کی راہ میں رکاوٹ الباکستانی مائنڈسیٹ تھا۔ بلوچستان پر الباکستان کا قبضہ اور ہزاروں بلوچوں کے اغوا اور قتلِ عام، مہاجروں کی زندگیاں اجیرن، پشتونوں کو دہشت گردوں کے روپ میں پیش کرنے کا عمل اور سندھی قوم پرستوں کا بُرا حال، کشمیر، افغانستان اور بھارت میں دہشت گردی، دنیا بھر میں دہشت گردی کے واقعات کے پیچھے بھی الباکستانی مائنڈ سیٹ نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی اِن ساری باتوں سے جی اوب جاتا تو میں پرانی ہندی اور پنجابی فلمیں دیکھنے بیٹھ جاتا۔ بہت ساری فلموں میں تقسیم سے پہلے کی کہانیاں ہوتی تھیں۔ ان پرانی فلموں کو دیکھتے دیکھتے ایک نئی پنجابی فلم 'لاہوریے' یوٹیوب پر میرے سامنے آگئی۔ امرندر سنگھ کی ایک خوبصورت فلم تھی۔ اس فلم کو دیکھتے ہوئے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ تقسیم کے ستر سال بعد بھی سکھوں اور ہندوؤں کی نئی نسلیں لاہور اور الباکستان کی محبت میں مری جاتی تھیں۔ اُن کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ ستر سال کے بعد الباکستان کی نئی نسلیں اپنی مادری دھرتی بھارت سے کتنی دور جاچکی تھیں۔ میں اکثر کہا کرتا تھا کہ الباکستانی تو تقسیم پر خوشیاں مناتے تھے کیونکہ اُن کو تقسیم کے نتیجہ زمین کا ایک ایسا ٹکڑا ملا تھا جو ان کا تھا ہی نہیں اور بھارتی اس لئے غمزدہ کہ اُن کی زمین اُن سے چھین لی گئی تھی۔ انگریزوں کی سازش نے اُن کی دھرتی کے ٹکڑے کر کے رکھ دیے تھے۔ اب اُن کی نئی نسلیں بھی اپنی کھوئی زمین کی محبت میں الباکستان کی طرف کھنچی چلی جاتی تھیں کیونکہ دھرتی ماں کی کشش تھی۔

٭٭٭٭٭

سولھواں باب

انڈین فنکاروں کی الباکستان میں پذیرائی

2019ء

الباکستان کے شہر الاہور جب امرندر گل کی ٹیم فلم شوٹ کرنے گئی تھی تو آئی ایس آئی نے نور اسٹوڈیو کو تلقین کی کہ اچھی ہیروئینوں کو سرداروں کی خدمت پر لگائے، پوری ٹیم کو اچھے کھانے کھلائے، ہوٹلوں میں رکھنے کی بجائے شہر کے اعلیٰ بنگلوں میں رکھا جائے، شراب اور شباب کا وافر انتظام ہو۔ ان پنجابی بھارتی اداکاراوں کا ایسا سواگت کیا جائے کہ وہ الباکستان کے چرچے کرتے نہ تھکیں۔ آئی ایس آئی کی نور اسٹوڈیو کو مکمل ہدایات تھیں کہ سکھوں کے دل میں الباکستان کی اتنی محبت ڈالیں کہ وہ بھارت کی سیاسی پارٹیوں کے حوالے سے متنفر ہو جائیں کہ وہ الباکستان کے ساتھ اچھے تعلقات نہ رکھنے کی ذمہ دار ٹھہریں۔ امرندر گل جی خود تو نامور اداکار اور فلم ساز تھے مگر اپنے بچپن سے دیکھے ہوئے الباکستانی ڈراموں کے عاشق تھے خاص طور پر اُن آنٹیوں کے جو لہک لہک کر اُردو بولتی تھیں۔ الباکستانی عورتوں کے لباس تو بھارتی پنجابیوں کو ویسے ہی بہت پسند تھے۔ نقاش احمد کُڑتے ہوئے دل کے ساتھ یہ سارا منظر نامہ دیکھتا رہتا تھا۔ وہ بھارتی پنجاب سے آئے اُس فلمی وفد کے گردا گرد آئی ایس آئی کی نامزد چھ اداکاراوں کی حرکتوں کا بخوبی جائزہ لے رہا تھا۔ دو تو منجھی ہوئی اداکارائیں تھیں اور اُن کے ساتھ چار نئی ابھرتی ہوئی لاہورڈیفنس کے بازار حسن کی رقاصہ نما اداکارائیں تھیں

جو پنجابی لہجے میں اُردو بولتے ہوئے سکھوں کے دل موہ رہی تھیں۔ سکھ اُن کی اُردو زبان پر فدا ہوئے جاتے تھے اور نقاش احمد اُن کے جعلی اُردو لہجے پر سر پیٹ رہا تھا۔ وہ سرداروں سے کہنا چاہتا تھا کہ سردار جی چھڈو ایہناں جعلی عورتاں نوں تسی اپنے نال آئیاں دو سُچیاں عورتاں دی عزت کرو۔ اس فلمی وفد میں شامل دونوں سکھ اداکارائیں سادہ اور تمیزدار عورتیں تھیں۔ نقاش احمد غور کر رہا تھا کہ وہ دونوں اداکارائیں الباکستانی آنٹیوں کے جعلی پن پر پریشان نظر آتی تھیں۔ عورتیں ہی عورتوں کے جعلی پن کی تہہ تک پہنچ سکتی ہیں، نقاش احمد نے سوچا۔ سردار الباکستانی عورتوں کے عاشق ہوئے جاتے تھے اور وہ عورتیں اسی کام کے لئے معمور کی گئی تھیں۔

☆☆☆☆☆

دوروز سے ایک اور ہائی پروفائل مہمان گلوکار دلیرے سنگھ کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اُن کی رہائش لئے ایک عالیشان بنگلہ کا انتظام کیا گیا تھا، دو خوبرو لڑکیوں کو ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ اُن کے تمام ٹی وی چینلوں پر انٹرویو کروائیں تاکہ الباکستان کا عظیم امیج بھارت میں قائم ہو۔ اُن لڑکیوں کو یاد دلایا گیا تھا کہ جب وہ پچھلی بار آئے تھے تو انہیں جو کھانے پسند آئے تھے، انہی کھانوں کا اہتمام کیا جائے۔ نقاش احمد سوچنے لگا کہ یہ سکھ لوگ الباکستانی پنجاب کے معاملے میں بہت سادہ لوح واقع ہوئے تھے۔ انہیں الباکستان آرمی کے سکھ برادری میں خالصتانی جذبات ہوا دینے کی سازش سمجھ ہی نہیں آتی تھی جبکہ نقاش احمد کو آرمی کی ایجنسیاں اس سازش کے بارے گھوٹ گھوٹ کر اپنے پلان بتاتی تھیں۔ اُن کا ایک واضح پلان ہوتا تھا کہ سکھوں کو ہندوستان کے خلاف کرنا ہے۔ حتٰی کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے سکھ لوگ خصوصی طور پر فنکار الباکستان کی خاطرومدارت کے جھانسے میں آ جاتے تھے۔ سکھ تو اپنی مذہبی جگہوں اور پنجاب کی مٹی کے دیوانے ہونے کی وجہ سے بچھ بچھ جاتے تھے اور الباکستان کے اکسانے پر بھارت کے خلاف کچھ بھی کہنے پر مائل ہو جاتے تھے۔

اوپر سے پنجابی لہجے میں اُردو بولنے والی الباکستانی لڑکیوں کی میزبانی ان سکھوں کو جذباتی کرنے کے لئے کافی ہوتی تھی۔ یہی کام کرتارپور کی راہداری پر الباکستان فوج کے لاڈلے وزیر اعظم کپتان خان سے کروایا جا رہا تھا۔ کرکٹر سدھو یوں جاہلانہ انداز میں خان کے لئے شاعری کرتا پھر رہا تھااور خان جیسا شاعری اور عقل سے عاری شخص اُلٹا سدھو کی تعریفوں سے شرمائے جا رہا تھا۔ سدھو خاتون ٹی وی اینکروں کے جھرمٹ میں خود کو راجہ رنجیت سنگھ سے کم نہیں سمجھ رہا تھا۔ کرتارپور کے نام پر الباکستان کا سارا ڈرامہ سکھوں کے دل موہ لینے کے ضمن میں کافی کامیاب جا رہا تھا جبکہ الباکستان کی انٹیلی جنس ایجنسیاں سکھوں کے جذبات کو جیت کر بھارت کے خلاف خالصتان کے ریفرنڈم کو دنیا بھر میں کامیاب کروانے کا مقصد رکھتی تھیں۔ میں کینیڈا میں بیٹھے سکھ کمیونٹی کے اس ریفرنڈم پر زوروشور کو بھارتی حکومت سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ اس لئے محسوس کر سکتا تھا کہ بھارتی پنجاب میں تو خالصتان کے ایجنڈے کی کامیابی کا امکان نہ تھا مگر کینیڈا، امریکہ اور برطانیہ میں خالصتانی برادری الباکستان کی ایجنسیوں کی مدد سے بھارت کے خلاف خوب کھل کر پروپیگنڈا کر رہی تھی۔ کینیڈا کی سیاسی جماعتیں ٹورونٹو، وینکوور اور کیلگری میں سکھ ووٹ بینکوں کے آگے کشکول لے کر کھڑی ہونے کے ناطے کسی قسم کے اصول ضابطے سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔

جھے جھاتیاں ہوندیاں لاہور نوں، تے چنڈی گڑھ گھیڑیاں کیوں ماردے.... نقاش احمد امریندر سنگھ کے گانے کے بول سنتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ تقسیم کے ستر سال گزر جانے کے بعد سکھوں کی نئی نسلیں بھی لاہور کی دیوانگی میں مری جاتی تھیں۔ پنجاب کے اصل کلچر میں تو بھارتی پنجابی سکھ اور ہندو ہی رہتے تھے، الباکستان کے پنجاب سے تو پنجابی تہذیب ختم ہو چکی تھی۔ الباکستان کے پنجاب میں تو پورا زور نظریہ الباکستان کے خودساختہ کلچر کا تھا یا پھر مذہب کا زور تھا۔' نقاش نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے امریندر کی فلم کو دیکھنا جاری رکھا۔ فلم دیکھنے کے دوران اُسے نجانے کیوں یہ احساس ہو رہا تھا کہ ذرا سا اپنا بازو پھیلائے گا تو امرتسر کے لاری اڈے کے ٹی اسٹال سے شیشے

کے گلاس میں الائچی والی چائے ہاتھ میں آجائے گی اور وہ اُسے سُڑ سُڑ پیتے ہوئے باقی کی فلم مزے سے دیکھے گا۔ اُس کا دایاں بازو غیر ارادی طور پر صوفے کے آخری سرے تک یوں پھیلا کہ جیسے امرتسر بازو بھر قریب ہو۔ امریندر کی فلم کو روک کر اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور گرداس مان کے صدابہار گانے 'کیہہ بنوں دنیا دا، واہ گرو جانے' کے بول اُس کے ذہن میں گونجنے لگے اور اُس کے گال 'اشک رواں کی نہر ہے' کے مصداق نمکین پانی سے تر بتر ہو گئے۔

*****

ستر واں باب

یوتھیوں کا سیاسی و سماجی مائنڈ سیٹ

2019ء

مسی ساگا میں کھلنے والے کڑاہی گوشت کے ایک نئے ریسٹورانٹ میں مٹن کڑاہی اپنے اصل ذائقے کے ساتھ کھاتے ہوئے تیز ادرک اور سالم دھنیے نے جہاں میری ناک کے دھانوں کو کھولا وہاں مجھے کچھ دیر کے لئے یہ بھی احساس ہوا کہ میں زندگی کے تیس سال پیچھے چلا گیا ہوں۔ میں سوچنے لگا کہ تازہ کڑاہی بھی کبھی کبھی وقت کے پہیے کو پیچھے کر سکتی ہے۔ تیز ادرک، سالم دھنیے اور اصل مصالحوں میں پکی تازہ کڑاہی کے ساتھ ریسٹورانٹ کا وہ پرانا ماحول بھی تھا جو وقت کو تھوڑی دیر کے لئے تیس سال پیچھے کر رہا تھا۔ دو سو سیٹوں پر مشتمل اس ریسٹورانٹ کے بھرے پرے ماحول میں میں لوگوں پر ایک اچٹتی نگاہ دوڑاتے ہوئے سوچنے لگا کہ 2019 کے آتے آتے الباکستانوں کی ایک بڑی تعداد اس شہر میں آباد ہو چکی تھی۔ اپنے ساتھ والی میز کے آٹھ لوگوں میں سے چار میری طرح کی درمیانی عمر کے دو جوڑے تھے۔ عورتوں نے حجاب اوڑھ رکھے تھے، مردوں کی کلین شیو تھی۔ اُن کے ساتھ دو نوجوان جوڑے تھے جن کے بارے میں نے اندازہ کیا کہ وہ اُن کی اولادیں ہوں گے۔ یہ خاندان خوشحال اور روایتی نوعیت کا لگتا تھا۔ اُس کے پیچھے کی میز پر ایک جوڑا اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نوجوان فیملی کے پیچھے چار خوبرو لڑکیاں ہنستی ٹھٹے مارتے ہوئے

سویٹ ڈش کھانے کے مرحلے تک آچکی تھیں۔ اپنے بائیں جانب جب اچانک میری نظر ایک مقامی ریڈیو ہوسٹ پر پڑی تو میں ٹھٹھکا، اس عورت کے بارے مجھے معلوم تھا کہ یہ انتہائی مکار اور جھوٹی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جعلی شاعرہ اور کھوکھلی دانشورہ کے طور پر بھی اپنے آپ کو پیش کیا کرتی تھی۔ یہ ریڈیو ہوسٹ ایک پروموٹر کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جو الباکستان کا یوم آزادی میلہ کیا کرتا تھا۔ یہ ریڈیو ہوسٹ اور وہ پروموٹر آئی ایس آئی کے مقامی ایجنٹوں کے بھی دم چھلے تھے اور بھارتیوں کے میوزک شو میں الباکستانی تماش بینوں کو لانے کا جھانسہ دے کر شو بھارتی پروموٹروں کے ہاتھوں سے اُچک لیا کرتے تھے۔ میری نظر جونہی اُن دونوں جھوٹے فراڈیوں پر پڑی تو میں ادرک اور دھنیے کی تیس سال واپس لانے کی صلاحیت کے طلسم سے نکل کر عین اس لمحے میں واپس لوٹ آیا جس لمحے میں ہم سب جی رہے تھے۔

☼☼☼☼☼

2019 میں احمد جمال کو جرمن دوئچے کا الباکستان میں نگران مقرر کیا گیا تو احمد جمال کی عمر باون برس کی ہو چکی تھی۔ بون میں دوئچے کی ملازمت کے دوران اُس نے الباکستانی مائنڈ سیٹ کی بھرپور طور سے مخالفت کی تھی مگر اب اُس نے ایک سینئر پوسٹ کو قبول کرتے ہوئے الباکستان منتقل ہونے کا خدشہ یہ سوچ کر مول لیا کہ اس اہم پوسٹ پر ہونے کے ناطے الباکستانی فوج اس کو اس طرح تنگ نہیں کرے گی جس طرح وہ بلاگرز کو اٹھا لیتی ہے۔ وہ جب اسلام آباد آیا تو اُس نے کپتان کی حکومت کے نئے الباکستان کو شدت کے ساتھ محسوس کرنا شروع کیا۔ الباکستانی ٹی وی چینلوں سے ویسے تو وہ پہلے ہی کافی واقف تھا مگر الپاکستان کی صحافتی دنیا میں رہتے ہوئے وہ اس کے سر پر سوار ہو گئے تھے۔ ان ٹی وی چینلوں کے ٹاک شوز اس نئی جماعت کے جوکر سیاستدانوں کو اس طرح پیش کر رہے تھے کہ عوام کو اب دوسری سیاسی جماعتوں کے سیاستدان اچھے لگنے لگے تھے۔ آئی ایس آئی کے سابقہ بریگیڈیئر آصف اس جماعت کو فخر کے ساتھ اقتدار میں لانے کے ضمن میں پیش پیش تھا۔ احمد جمال ایک دن

بریگیڈیئر آصف کو کہیں مل گیا، اُس نے بریگیڈیئر کو احساس دلایا کہ بریگیڈیئر صاحب اب تو عوام کا آئی ایس آئی سے بھی اعتبار اٹھ گیا ہے۔ ایک ریٹائرڈ افسر ہونے کے ناطے اُس نے احمد جمال جیسے جہاندیدہ صحافی کے سامنے پرائیویٹ طور پر اعتراف کرتے ہوئے اُس کی رائے کی تائید کی۔ ریٹائرڈ کرنل عارف کے گھر میں وہسکی پیتے ہوئے کرنل اور بریگیڈیئر دونوں نے احمد جمال کو بتایا کہ الباکستان کی خفیہ ایجنسیوں کے نئے افسران اس قدر نالائق ہیں اور وہ لوگوں کو اٹھانے، زدوکوب کرنے اور حتٰی کہ قتل کر دینے کی حد تک اس قدر جانگلی ہو چکے ہیں کہ انہیں اندازہ ہی نہیں کہ ملک مالی طور پر کنگال ہو چکا ہے اور دنیا کے سامنے اُن کی تذلیل ہو رہی ہے مگر وہ اس ریاست کے اندر اپنی ریاست کی طاقت کے نشے میں اس قدر چور ہیں کہ انہیں اگلے چند سال بعد کی تباہی کی سنگینی کا اندازہ ہی نہیں۔ ”بریگیڈیئر صاحب، آپ کو اب ریٹائرمنٹ کے بعد اسٹیبلشمنٹ کی خامیاں کیوں نظر آ رہی ہیں، اسٹیبلشمنٹ کے اندر رہتے ہوئے یہ خامی کیوں نظر نہیں آئیں“ احمد جمال نے بریگیڈیئر آصف سے پوچھا۔ ”یار آپ کو کیا بتائیں، اسٹیبلشمنٹ کے اندر رہتے ہوئے بہت کچھ نظر آتا تھا، خامیاں بھی اور خوبیاں بھی مگر اقتدار کی طاقت ہر قسم کے ادراک کو کم سے کم کرتی چلی جاتی تھی۔

*****

میں جب الباکستانی سیاست یا پھر ہایپر پیٹریاٹک الباکستانیوں سے سوشل میڈیا پر رابطے میں آؤں تو وہ اپنی غیر منطقی باتوں سے میرا خون کھولا دیتے ہیں اور میں اپنی سوچوں میں کھولاہٹ کا شکار ہوتے ہوئے نیم گال گلوچ والی زبان اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں اور جب میں اُن کی سیاسی آگ کو بھولتے ہوئے میلان کنڈیرا کے ناول پڑھتا ہوں تو زندگی کی گہرائی اور ٹھہری سوچ کے بہاؤ میں بہتا فکر اور تخلیق کے نئے سے نئے زاویے تراشنے لگتا ہوں۔ آج میں میلان کنڈیرا کا ناول ’شناخت‘ پڑھتے ہوئے انسانی تلاش کے المیے میں گم ہوں مگر کل ایک صحافی کی الباکستانی کشمیری پروپیگنڈے پر مشتمل نیوز رپورٹ ٹی وی پر دیکھتے ہوئے اس کی عقل پر ماتم کناں تھا کہ کیا یہ شخص

اس حد تک جاہل ہو سکتا تھا۔ اُس صحافی کے خیال سے باہر نکل کر میں دوبارہ شناخت کے مسئلہ پر غور کرنے لگا۔ میری شناخت بنیادی طور پر تو بھارتی پنجابی رہے گی بھلے سے میں الباکستان کے مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا۔ ہر الباکستانی، بنگالی، نیپالی، سری لنکن اپنی قومیت یا ملک سے تعلق رکھنے کے باوجود اسی طرح بھارتی ہے جس طرح جرمن، فرانسیسی وغیرہ جرمن اور فرانسیسی ہونے کے ساتھ ساتھ یورپین بھی ہوتے ہیں۔ لہذا میں اب بھارتی تہذیب سے تعلق رکھنے والا کینیڈین پنجابی ہوں جو الباکستانی پنجاب کے ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ مسلم تو کسی قومیت کا نام نہیں۔ الباکستان کا قیام ہندو مسلم دو قوموں کی بنیاد پر کرنے والے مسٹر جناح نے ایک ایسے سیاسی مبالغے پر رکھی جو اب کپتان خان تک آتے آتے پکا جھوٹ بن چکی تھی۔

☼☼☼☼☼

میں چوکیدار ہوں، بھارتی چناؤ 2019 میں مودی جی کا یہ نعرہ جہاں بھارت کی سول سوسائٹی کے لئے مذاق کا موجب بنا وہاں بھارت کی کروڑوں عوام بی جے پی اور مودی کے لئے جذبے کے ساتھ باہر نکل پڑی۔ مودی جہاں عام عوام کے پسندیدہ نیتا تھے وہاں سیٹھوں کے بھی چہیتے تھے۔ غریبوں اور امیروں سبھی کو یہ وشواس تھا کہ مودی کرپٹ نہیں۔ دوسری طرف لیفٹ، کانگریس اور مودی مخالف علاقائی جماعتیں اور سیاسی اتحادوں نے مودی کو ہرانے کے لئے تمام ہتھکنڈے برتے مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی۔

☼☼☼☼☼

کراچی کی معروف کال گرل صنم خان نے فیس بک لائیو کے دوران انڈین گاہکوں کو جواب دیا کہ الباکستان آرمی انڈیا کے الباکستان پر کسی قسم کے حملہ کا ایسا منہ توڑ جواب دے گی کہ وہ منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ انڈیا کی کرکٹ ٹیم اگر الباکستان سے جیت جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جنگ بھی جیت سکتے

ہیں۔ اس نے صاف کہا کہ اللہ نے الباکستان آرمی کو بہت مضبوط بنایا ہے۔ صنم خان کے دلال جانباز خان اور صنم خان کا دبئی بہت آنا جانا رہتا تھا جہاں جانباز اُس کے لئے انڈین کمیونٹی کے گاہک پکڑتا تھا۔

٭٭٭٭٭

ٹورونٹو کی معروف کال گرل اور مقابلہ حسن کروانے والی ثمینہ خان بھی انڈین گاہکوں کی زیادہ منتظر رہتی تھی کیونکہ وہ اس کو اچھی رقم دیتے تھے لیکن پاکستان کے جذبہ حب الوطنی میں وہ بھی الباک آرمی کی عاشق اور انڈینز کی مخالف تھی۔

٭٭٭٭٭

اٹھارواں باب

یوتھیوں کی ورلڈ وائڈ سیاسی سوچ اور کپتان خان کی حکومت کا خاتمہ

الباکستانیوں کا مضحکہ خیز المیہ یہ تھا کہ وہ کسی معمولی سی بات کو بھی نیشنل پرائیڈ بنا لیتے تھے۔ وہ اپنے آپ سے جھوٹ بولتے بولتے جھوٹ کو ہی سچ سمجھنے لگے تھے۔ بھارت کے ساتھ اپنا جھوٹا سچا موازنہ کرتے کرتے اُن کے ذہن اپاہج ہو چکے تھے۔ خاص طور پر 2000 کے عشرے سے بھارت اور بھارتیوں نے جس طرح ترقی کرنا شروع کی تھی وہ اُن سے ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ الباکستانی تو اپنے اسلامی ہونے کے ناطے برتر ہونے کے جھوٹے زعم سے باہر نہیں نکل رہے تھے۔ اُدھر بھارت کی بین الاقوامی سطح پر ساکھ مضبوط سے مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ 2014 کو بننے والی مودی سرکار نے بھارت کو ایک برانڈ کے طور پر دنیا میں ابھارا تھا۔ الباکستان کے میڈیا اور آئی ایس آئی نے مودی کے خلاف لاکھ پروپیگنڈا کیے، بھارت کی اپوزیشن اور لیفٹ میڈیا کے ساتھ مل کر مودی کو ڈرائیکولا، قاتل، جمہوریت دشمن اور نجانے کیا کیا القابات دیئے، مودی 2019 میں پھر بھاری اکثریت کے ساتھ حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ الباکستان کی آئی ایس آئی مودی کو کسی صورت بھی دوبارہ وزیر اعظم نہیں دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ اُس نے بھارت کی طاقت کو الباکستان پر حاوی کرنا شروع کر دیا تھا۔ الباکستان کی نسبت بھارت کے پاس اسلحہ بہترین تھا، پیسہ تھا، بین الاقوامی ساتھ بھی تھا۔ الباک آرمی کا بہروپیا چہرہ

دنیا کے سامنے آشکار ہو رہا تھا۔ مودی نے الباکستان کی دہشت گردی کی کارروائیوں پر بھی بند باندھنے شروع کر دیئے تھے۔ کشمیر پر بھارت کا روایتی کمزور رویہ چھوڑ کر کشمیر کو عملی طور پر اپنا اٹوٹ انگ بنانے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ کشمیر کے نام پر دکان داری کرنے والے چند خاندانوں کی سیاسی بلیک میلنگ سے باہر نکلنا شروع کر دیا تھا۔ اُدھر الباکستان میں ایک ڈفر اور مغرور شخص کپتان خان وزیراعظم کی صورت میں قوم پر نازل ہو چکا تھا جو بظاہر تو ولایت کا پڑھا لکھا تھا مگر اُس کی جہالت اُس کے ہر لفظ، باڈی لینگویج اور چہرے کے حرکات وسکنات سے ہر لحظہ جھلکتی تھی۔ یہ کبھی جاپان اور جرمنی کی سرحدیں ملاتا تھا، کبھی دوسوارب ڈالرز الباکستان لانے کی بات کرتا تھا، کبھی مرغیوں اور انڈوں سے اکانومی بہتر بنانے کے فارمولے دیتا تھا، کبھی روحانیت کو سائنس کا درجہ عطا کرتا تھا۔ یہ شخص مجموعی طور پر الباکستان کی نام نہاد پڑھی لکھی کلاس کا ویسا ہی ڈفر نمائندہ تھا جیسا کہ خود یہ ڈفر کلاس تھی۔ تشخص کے بحران کی ماری اور غرور وتکبر کے دلدل میں پھنسی۔ اس کی سیاسی پارٹی کے نئی نسل کے جذباتیوں کو سمجھدار سوشل بلاگرز نے اُن کا نام یوتھیے رکھ چھوڑا تھا۔ کپتان خان نے الباکستان میں سیاحت کو فروغ دینے کی مہم کو تیز کرنے کی خاطر کچھ امریکی اور یورپین لڑکیوں کو خصوصی سہولتیں فراہم کیں تاکہ وہ ٹوئٹر پر الباکستان کا تاثر بہتر بنائیں۔ سیاحت اُن کی کوششوں سے کہاں بڑھنی تھی کیونکہ ریاست اور سماج کا ڈھانچہ ہی کسی سیاحتی ملک جیسا نہیں تھاالبتہ یہ لڑکیاں رمضان کے دوران افطار پارٹیوں کے بارے اچھے اچھے ٹویٹ کرتی رہتی تھیں۔ کپتان خان الباکستان کے شمالی علاقوں کی خوبصورتی کا اپنی جاہلانہ تقریروں میں نقشے کھینچتے ہوئے اور بھارت کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے یہ بھول جاتا تھا کہ الباکستان کے تین چار تاریخی نوعیت کے لاہور، ٹیکسلا، موہنجوداڑو، پشاور اور کراچی جیسے شہر بھی اپنی ثقافت اور تہذیب سے کوسوں دور ہٹ چکے تھے جبکہ بھارت میں دو سو سے بھی زیادہ شہر تھے جو اپنی تہذیبی رنگا رنگی اور ثقافتی چکاچوند پوری دنیا سے آئے سیاحوں پر نچھاور کرتے تھے۔ بھلے سے وہ دلی، ممبئی، کلکتہ اوربنگلور جیسے کاسمو پولیٹین شہر ہوں

یا پھر وارانسی، امرتسر، شملہ، دہرہ دون، لکھنو، پٹنہ، بنگلور، احمد آباد، گوا، چنئی، اجمیر، جے پور، اُدے پور، بھوپال، گاندھی نگر، احمد آباد، ناگ پور، اگرتلہ، اندور، پوڈوچیری، جموں، رانچی، میرٹھ، آگرہ، حیدرآباد، سورت، چنڈی گڑھ، کانپور، پٹیالہ، پونا، رائے پور، بریلی، بھوپنسوار، میسور، سہارنپور، علی گڑھ، نینی تال، سلی گڑی، جھانسی، روہتک، امروہہ جیسے سینکڑوں تاریخی اور ثقافتی شہر ہوں جن کی سیر کرنے والے کبھی بھی ان شہروں کو اپنی یادوں سے نکال نہیں سکتے۔ الباکستان کو بھارت سے موازنہ کرنے کے زعم میں رہنے والے بھارت کی قائم دائم ثقافتی رنگارنگی کا دور دور سے بھی موازنہ نہیں کر سکتے تھے۔بھارت کے 2019 کے الیکشنز کے دوران ایک الباکستانی بھارتی صحافی آتش کبیر کا ایک مضمون ٹائمز میگزین نے کوراسٹوری کے طور پر چھاپا تو کبیر کو شہرت مل گئی تھی، الباکستانی اسٹیبلشمنٹ اور بھارت کی نام نہاد لیفٹ اشرافیہ نے اس سطحی آرٹیکل کو ہوا دینا چاہی مگر اس آرٹیکل کے ذریعے اس بات سے زیادہ اہمیت نہ تھی کہ یہ آرٹیکل بھی بھارت کے ہندوورتے کو نہ سمجھنے کا ایک منہ بولتا ثبوت تھا مگر الباکستانی اسٹیبلشمنٹ اور بھارت کی اشرافیہ کا گٹھ بندھن خوشی سے بغلیں بجاتا رہا دوسری طرف مودی جی ایک بار پھر بھارتی عوام سے ایک بڑا مینڈیٹ لے کر حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ الباکستانی وزیراعظم بھارتی وزیراعظم کو خط لکھتے رہے مگر بھارت نے طے کر لیا تھا کہ الباکستان کو اب بھارت کے ساتھ کھیلنے کا مزید موقع نہیں دیا جائے گا۔ مودی جی کا جملہ "گولی اور بارود کے ماحول میں بات چیت نہیں ہو سکتی" کافی مقبول ہوا تھا۔ یہی لگتا تھا کہ الباکستان پر بین الاقوامی دباؤ اب بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کے لئے بڑھ رہا تھا مگر بھارت الباکستان کے خالی دعوؤں پر اب اعتماد کرتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ الباکستان کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی بین الاقوامی سطح پر حرکتیں بھی مالی وسائل کے کم ہونے سے کچھ گھٹتی نظر آ رہی تھیں۔ کپتان وزیراعظم کے دوسرے گھر لندن میں الباکستانی نژاد کاروباری شخصیات، سیاستدانوں اور صحافیوں کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی سے آئی ایس آئی کو براہ راست اور بالواسطہ مدد ملتی تھی۔ میرپور اور گجرات

سے برطانیہ منتقل ہونے والے سادہ لوح مزدور طبقے کی اولادوں میں سے کئی ایک چہرے اب برطانیہ کی سیاست، کاروبار اور میڈیا کے افق پر سامنے آ رہے تھے۔ اُن کو الباکستانی اسٹیبلشمنٹ بھرپور پروٹوکول دیتی تو وہ اپنی شان کو بڑھانے کی خاطر اپنی الباکستانی ثقافتی میراث کی طرف رجوع کرتے۔ کپتان وزیراعظم کے قریبی امیر دوستوں کو دیکھتے ہوئے مزید الباکستانی نژاد برطانوی کپتان سے راہ ورسم بنانے کی کوشش کرتے تو اسٹیبلشمنٹ اُن کو بھی اپنے آلہ کار کے اندر لانے کی کوشش کرتی۔ اسٹیبلشمنٹ کپتان کی برطانوی الباکستانیوں میں مقبولیت کی وجہ سے اُسے وزارت عظمٰی کے عہدہ پر لے کر آئی تھی۔ الباکستان کارڈ کھیلنے کے ساتھ ساتھ اسٹیبلشمنٹ اور ڈپلومیٹس اپنے خاندانوں کو برطانیہ میں منتقل کرنے کے راستے بھی ڈھونڈتے رہتے تھے۔

*****

خیر میرے نزدیک یہ بات بھی نہیں تھی کہ مجھے بھارت کا سماج ایک آئیڈیل سماج لگتا تھا۔ بھارت کے سماج کی بالی وُڈ کی اسکرینی چکا چوند نے بھارتی گلی محلوں کی زندگی کو ماند کیا ہوا تھا حالانکہ بھارت کے گلی کوچوں کی زندگی بالی وُڈ سے بھی بڑھ کر تھی۔ دلی کے جنتر منتر مندر کی منڈیروں پر بھُدکتے بندروں، پانی سے بدکتے کتوں، آس پاس کی گلیوں کے آوارہ لڑکوں کے لڑکیوں کو تاڑنے کی حسرت، گلیوں محلوں کے دال چاول اسٹالوں پر لگی گاہکوں کی قطاروں، ٹریفک کے شور میں چلتی گاڑیوں کے بیچ پیدل چلتے لوگوں کی پھرتیوں کو دیکھتے ہوئے انسانی جسموں کے سیلاب کو فٹ پاتھ کے کنارے دیکھنے والا کوئی بھی شخص عورت مرد کی جسمانی نزاکتوں کے فرق سے بے نیاز ہو جاتا ہے حتٰی کہ وہاں تو کوئی برقعے والی عورت کے برقعے کو بھی نفرت سے نہیں دیکھتا۔ زندگی بہت ہی نیچرل تھی۔ الباکستان میں تو ہر شے جعلی لگتی تھی۔

*****

"یہ سچ ہے کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ الباکستان ہے" بھارت کے معروف اُردو شاعر نے ٹورونٹو کی ایک نجی نشست کے دوران گپ شپ کرتے ہوئے کہا۔ اس محفل میں اس شاعر کے علاوہ باقی سب الباکستانی تھے، اگر یہ کوئی بڑی محفل ہوتی تو بھارتی مسلمان شاعر کی اس رائے کے جواب میں ہنگامہ بھی ہو سکتا تھا لیکن چونکہ یہ ایک گھریلو محفل تھی اور نیز اس میں شریک بیشتر مہاجر خاندان تھے اس لئے انہوں نے سوالیہ نشان والے اپنے چہرے پیش کرتے ہوئے جاننا چاہا کہ اُن کے مہمان شاعر ایسا کیوں سمجھتے ہیں۔ "دیکھیں جی، شروع دن سے الباکستان نے بھارت کے خلاف غنڈہ گردی ہی کی ہے۔" بھارت کے مسلمان شاعر نے اپنا موقف پیش کیا۔

*****

2022ء

وزیراعظم کپتان خان جب اپنی جنوں والی بیوی کے ساتھ اپنی پارٹی کے گلوکار اسرار کے گانے بلو کے نئے ری ٹیک کو ٹی وی پر دیکھ رہے تھے تو بیوی نے وزیراعظم کو کہا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ اس طرح کا ناچ گانا آہستہ آہستہ نئے الباکستان سے ختم ہو جائے۔ کپتان خان نے تسبیح کے دانوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بیگم کی طرف دیکھا اور کہا کہ بیگم جس طرح تم اور میں اللہ کی راہ پر آئے ہیں اس میں بھی وقت لگا ہے۔ پھر کپتان نے ٹی وی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک دن یہ لوگ بھی اللہ کی راہ پر آجائیں گے۔ کپتان کو اچانک بیوی کی بات یاد آئی جو اُس نے خان کے ساتھ ڈیٹ کے دنوں میں کہی تھی کہ "خان صاحب اب آپ سیدھے راستے پر چل پڑیں اور پلے بوائے کی زندگی چھوڑ دیں کیونکہ اب آپ نبوت والی ساٹھویں دہائی میں داخل ہو چکے ہیں۔" ڈیٹ کے اُن دنوں کی بات کو یاد کرتے، بیگم کے پہلو میں بیٹھے، تسبیح کے دانے پھیرتے، اسرار کے بلو گانے کی نئی ری ٹیک کو دیکھتے کپتان خان کو بہت ساری عورتیں الف ننگی نظر آنے لگیں لیکن اپنے اندر موجود ایک بھاگڑ جنسی بلے کی پھرتیوں کی کمی

کو محسوس کرتے ہوئے اُسے تھوڑی دیر کے لئے ڈپریشن سی ہوئی۔ فوراً اُسے یہ خیال بھی آیا کہ انسانوں کے ننگے جسموں کا خوف اُس پر کیوں چھانے لگا ہے؟ اس خیال کو رد کرنے کے لئے اُس کے تسبیح کے دانوں پر انگلیاں پھیرنے کی بجائے بیوی کے بالوں میں انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں۔

*****

"الباکستان کو کچھ نہیں ہو گا"، کینیڈا میں رہنے والے ایک منجھے الباکستانی نژاد صحافی نے اپنی رائے میرے ساتھ سانجھی کی۔ "کیا کہنا چاہتے ہو اور پھر مجھے اس بات سے کیا لینا دینا؟" میں نے اس کی بات بھی جاننا چاہی اور اپنی بے اعتنائی بھی جھاڑی۔ "میرا مطلب ہے زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا، پہلے بنگلہ دیش الگ ہوا، ہو سکتا ہے آنے والے سالوں میں بلوچستان، پختونخواہ اور سندھ بھی الگ ہو جائیں، مگر پنجاب الباکستان کا روپ دھار لے گا، بریلوی سنیوں کی اکثریت والا ال پنجاب جس کو پنجابی آرمی چلاتی رہے گی حتٰی کہ بریلویوں کی احمدیوں کے ساتھ شدید نفرت کے باوجود پنجابی احمدی بھی اپنی پنجابی فوج کے عاشق رہیں گے اور یوں یہ نظریہ الباکستان قائم رہے گا۔" میرے دوست صحافی نے کپتان خان کی حکومت کے خاتمہ کے موقع پر اپریل 2022 میں میری گفتگو کا باب جیسے بند کر دیا اور میں نے بھی سر دست اس ناول کو لکھنا بند کر دیا۔

اپریل، 2022ء

تعارف

طاہر اسلم گورا کا ناول الباکستان حقیقی بھی ہے اور فرضی بھی۔ حقیقی اس طرح سے کہ یہ ایک دیش کا مقدر بن چکا ہے کہ وہ اپنی بھارتی شناخت کو خود ہی چھوڑ کر عرب بننے کے شوق میں خود کو الباکستانی سمجھتا ہے۔ اور یہ ناول فرضی یوں ہے کہ اس دیش کے باسی خود کو الباکستانی بننے کا خواب دیکھتے ہیں۔ یہ ناول ایک دیش اور اُس کے باسیوں کے تشخص کے بحران کے المیے کو معاشرتی، سیاسی اور نظریاتی سطح پر دکھاتا ہے۔ طاہر اسلم گورا کے اس سے قبل 'مہلت'، 'رنگ محل' اور 'تہذیبی رنجشیں' کے عنوان سے ناول شائع ہو چکے ہیں۔ 'الباکستان' کے علاوہ طاہر اسلم گورا کے دو مزید ناول 'ایک نامکمل زندگی' اور 'کوڈوڈوبا کے دنوں کا ملٹی کلچرل ازم' اردو، ہندی اور انگریزی میں اشاعت کے مراحل میں ہیں۔ طاہر اسلم گورا نے اپنے ناولوں میں کرداروں اور معاشروں کے دوغلے رویوں اور جھوٹوں کو انتہائی گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اُن کی نظموں کے مجموعے 'منظر آنکھوں میں ٹھہرے رہتے ہیں' میں جدید حسیات کی شاعری پڑھنے کو ملتی ہے۔ طاہر اسلم گورا بھارت میں اپنے کینیڈین ٹیگ ٹی وی کے حوالے سے کروڑوں لوگوں میں جانے جاتے ہیں۔

Price: ₹ 260.00
978-93-90885-46-6
Kautilya
Buy online at